اسلام کا نظریہ تاریخ

محمد مظہر الدین صدیقی

اسلام کا نظریہ تاریخ

محمد مظہر الدین صدیقی

مکتبہ جمال
تیسری منزل، حسن مارکیٹ، اردو بازار، لاہور
فون: 7232731 Mob: 0300-8834610
Email: maktabajamal@yahoo.co.uk
maktaba_ jamal@email.com

نام کتاب: .... اسلام کا نظریہ تاریخ

مصنف: .... محمد مظہر الدین صدیقی

اہتمام: .... میاں غلام مرتضیٰ کھٹانہ

ناشر: .... مکتبہ جمال ۰ لاہور

مطبع: .... تایا سنز پرنٹرز ۰ لاہور

سن اشاعت: 2009ء

قیمت: .... 200 روپے

ملنے کا پتہ:

تیسری منزل، حسن مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

Mob: 0300-8834610 فون: 7232731

Email: maktabajamal@yahoo.co.uk

maktaba_ jamal@email.com

فہرست مضامین

حصہ اول

حصہ دوم

تمہید

افراد اور اقوام کی زندگی میں جو انقلابات اور تغیرات واقع ہوتے ہیں، اُن سے بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ انسان اپنے مستقبل کی تعمیر و تشکیل اور اپنی قسمت کے بناؤ بگاڑ پر قادر نہیں۔

ہر فرد اور ہر قوم کی کوشش ہوتی ہے کہ اگر وہ اپنی موجودہ حالت سے آگے کی جانب قدم نہ بڑھ سکے تو کم سے کم پیچھے ہٹنے پر بھی مجبور نہ ہو۔ اگر ترقی اور اصلاح کے منازل نہ طے کر سکے تو اپنے آپ کو پستی اور ذلت ہی سے محفوظ رکھے۔ لیکن اس قسم کی کوششیں بار ہا ناکام بھی ہو جاتی ہیں۔ افراد پر خوشحالی اور آسودگی کے بعد اکثر اوقات تنگی اور افلاس کا دور آ جاتا ہے تو میں عروج و ترقی اور آزادی کے بعد محکومی، ذلت اور اقتصادی بدحالی میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ اسی تغیر حال اور انقلاب کیفیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن مجید فرماتا ہے:

وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ (۳:۱۴۰)

اور یہ زمانہ کے انقلابات ہیں جن کو ہم لوگوں میں گردش دیتے رہتے ہیں۔

اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا (۹۴:۶)

آسودگی اور خوشحالی کے ساتھ تنگی اور افلاس بھی لگے ہوئے ہیں۔

وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِى الْاَرْضِ وَ نَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِيْنَ O (۲۸: ۵)

اور ہم نے ارادہ کیا کہ جو لوگ دنیا میں ذلیل و حقیر سمجھے جاتے ہیں، انھیں اقوام عالم کا لیڈر بنا دیں اور انھیں وراثت ارضی عطا کریں۔

لیکن جب کسی گروہ یا خاندان پر خوشحالی اور قوت واقتدار کا ایک طویل دور گزر جاتا ہے تو اس کے افراد اس دھوکا میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ یہ صورت حال ہمیشہ باقی رہے گی اور ہماری دولت وقوت اور طاقت واقتدار اتنی مستحکم اور محفوظ بنیادوں پر استوار ہے کہ اب اس کے زوال یا خاتمہ کا کوئی اندیشہ اور امکان نہیں۔ مگر یہ پندار وغرور بھی بالآخر تاریخ کے ہاتھوں شکست کھا جاتا ہے۔ آسودہ حال افراد تباہ و برباد اور طاقت واقتدار کے اجارہ دار ذلیل وخوار ہو جاتے ہیں۔ یہ عمل تاریخ کے انقلابی ادوار میں اتنا نمایاں اور متواتر ہوتا ہے کہ کوئی فرد یا قوم اپنے آپ کو اس سے مامون ومحفوظ نہیں سمجھ سکتی۔ البتہ امن وعافیت اور تہذیبوں کے عروج واستحکام کے زمانہ میں انقلابی اتار چڑھاؤ کا یہ عمل سست رفتار ہوتا ہے، اس لیے خوشحال افراد، ذی اثر خاندان اور جاہ واقتدار رکھنے والے طبقے مکافات عمل اور جزاوسزا کے قانون کی خاموش رفتار اور غیر محسوس مصروفیت سے دھوکا کھا کر یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ہمارے اعمال کا کوئی حساب لینے والا نہیں ہے اور ہم جو چاہیں کریں۔ ہمیں کوئی طاقت اپنی جگہ سے ہٹا نہیں سکتی۔ حالانکہ ان کے اعمال ناگزیر طور پر ان کی تباہی کے اسباب جمع کرتے رہتے ہیں۔ قدرت کے اسی قانون مکافات اور تاریخ کی اسی انتقامی کارروائی کا ذکر کرتے ہوئے قرآن حکیم فرماتا ہے:

وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (۲:۷۴)

(یہ نہ سمجھو کہ) اللہ کا قانون جزاوسزا تمھارے اعمال کی طرف سے غافل ہے۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُo (۱۴ : ۴۲)

یہ گمان (ہرگز) نہ کرنا کہ اللہ (کا قانون جزاوسزا) ظالموں کے اعمال کی طرف سے غافل ہے۔ بلکہ ان اعمال کے نتائج کو اس روز تک موخر کر دیتا ہے جب کہ آنکھیں پتھرا جائیں گی۔

افراد انسانی کی بہت بڑی تعداد یہ سمجھتی ہے کہ اس کی دنیوی خوشحالی اور مادی ترقی کا دارومدار اس کی اپنی سعی وکوشش پر ہے۔ قوم کی تقدیر کے بناؤ یا بگاڑ سے ہماری ذاتی فلاح و بہبود کا جو گہرا تعلق ہے اکثر اوقات ہم اسے بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یہ غلط فہمی بھی لوگوں کو اسی

زمانہ میں پیدا ہوتی ہے جب قوم اپنی ابتدائی جدوجہد اور سعی بقا کے بعد ہر قسم کے خطرات و آفات سے محفوظ ہو جاتی ہے اور اس کی ترقی اور خوشحالی کا دور شروع ہوتا ہے۔ ایسے زمانہ میں لوگ اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ ان کے اسلاف نے اپنے ذاتی مقاصد، شخصی اور خاندانی مفادات اور اپنی ادنیٰ خواہشات کی قربانی کر کے اجتماعی ایثار اور اعمال صالحہ کے ذریعے امن و عافیت اور ترقی اور خوشحالی کے مواقع پیدا کیے تھے۔ اور اگر ہم اس امن و عافیت اور ان مواقع ترقی کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں ترقی اور بڑائی یا خاندانی مرفہ الحالی کی دوڑ میں اتنا منہمک نہ ہونا چاہیے کہ ہم قوم کی تقدیر اور اس کے مستقبل کی طرف سے بالکل غافل اور لاپروا ہو جائیں اور اپنی قوت و دولت کو صرف ذاتی اور خاندانی اغراض پر صرف کرتے رہیں۔ اس کے برعکس ہوتا یہ ہے کہ جب قوم کا اجتماعی وجود محفوظ ہو جاتا ہے تو لوگ اپنی ذاتی ترقی اور بڑائی کی دھن میں قومی اغراض اور اجتماعی مفادات کے لیے قربانی کرنے سے گریز کرنے لگتے ہیں۔ ان کی شخصی تقدیر اور ان کے ذاتی مستقبل کا قومی تقدیر سے جو گہرا تعلق ہوتا ہے اسے بالکل فراموش کر دیتے ہیں۔ اپنی ادنیٰ خواہشات، فوری منافع اور عیش و راحت کی ہوس میں اتنا گرفتار ہو جاتے ہیں کہ ضمیر و اخلاق کے تقاضوں اور بلند تر اجتماعی مقاصد کے لیے تکلیف اٹھانے کا خیال بھی ان پر گراں گزرنے لگتا ہے پھر جب ان خود غرضیوں، غفلتوں اور بداعمالیوں کے باعث کسی سخت اقتصادی آفت یا سیاسی بحران میں مبتلا ہو جاتی ہے یا اس پر اور کوئی بڑی تباہی نازل ہوتی ہے تو افراد کی تقدیریں بھی اس تغیر حال کے ساتھ بدلتی ہیں۔ مرفہ الحال تاجر مفلس و قلاش ہو جاتے ہیں۔ بے شمار اہل صنعت کساد بازاری کی وجہ سے نقصان اٹھاتے ہیں۔ متوسط الحال افراد بیروزگاری میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ مزدوروں کی آمدنیاں دفعتہً گھٹنے لگتی ہیں۔ اگر قوم اپنی مسلسل بدکرداریوں اور بدمستیوں کی وجہ سے کسی دوسری ملکی طاقت سے شکست کھا جاتی ہے تو اس کا حکمران طبقہ اچانک مقام عزت سے قعر مذلت میں گر جاتا ہے۔ اس کے تعلیم یافتہ اور ذہین افراد، اس کے عہدہ داران نظم و نسق، اس کے ماہرین فن تاجر، صناع، صحافی اور اہل قلم سب کے سب اپنی سابقہ حیثیت کھو بیٹھتے ہیں اور کس مپرسی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو

جاتے ہیں۔ اس وقت لوگوں کو محسوس ہوتا ہے کہ ان کی قسمتیں قوم کی قسمت کے ساتھ وابستہ ہیں اور جب تک قوم بحیثیت مجموعی طاقتور اور ترقی پذیر نہ ہو کوئی فرد محض اپنی ذاتی محنت یا جدوجہد سے مقامِ عزت یا وسائل دولت حاصل نہیں کر سکتا۔

لیکن افراد کی ذاتی قسمت اور قوم کی اجتماعی تقدیر کی اس باہمی وابستگی کا احساس بھی لوگوں کو اپنی پستی، ذلت اور تباہی کے حقیقی اسباب سے آگاہ نہیں کر سکتا۔ اگر اس قسم کی اجتماعی آفت یا شکست کی وجہ سے قوم کے مجموعی طرز فکر میں کوئی تبدیلی نہ پیدا ہو، تو ہوتا یہ ہے کہ جب قوم اس قسم کے کسی سیاسی یا اقتصادی بحران میں مبتلا ہوتی ہے یا اسے کوئی دوسری طاقتور قوم مغلوب و مفتوح کر لیتی ہے تو قوم کے اکثر و بیشتر افراد اس تباہی کو کسی ایسے سبب پر محمول کرتے ہیں جس کا اس کے حقیقی سبب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ چنانچہ بعض اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ ہمارے فوجی جنرلوں کی اجتہادی غلطی سے ہمیں شکست اٹھانی پڑی۔ کبھی ساز و سامان کی قلت اور آبادی کی کمی کا رونا رویا جاتا ہے۔ کچھ لوگ اقتصادی اسباب کی جستجو کرنے لگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے معاشی حالات کی خرابی سے یہ بحران واقع ہوا۔ اگر بینک کاری کا نظام فلاں فلاں اصولوں پر قائم ہوتا تو یہ اقتصادی تباہی نہ آتی۔ اگر زر اور تسلیک کے بارے میں ہماری پالیسی فلاں فلاں نقائص سے پاک ہوتی تو ہم ان آفات سے محفوظ رہتے۔ غرض کہ یا تو جزوی اور ظاہری اسباب کو حقیقی اسباب قرار دیا جاتا ہے یا دشمنوں اور مخالفین کو اس شکست و تباہی کے لیے مورد الزام قرار دے کر اپنی اور قوم کی کمزوریوں اور فروگزاشتوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ بعض لوگ اس قسم کی تباہی کو محض اتفاقی حوادث کہہ کر ٹال دیتے ہیں۔ کیوں کہ ان کی قوتِ فکر اتنی پختہ نہیں ہوتی کہ وہ واقعات کی صحیح علت تلاش کریں۔ اس قسم کے کمزور فکر والے لوگ اگر ان پر مذہبی رنگ غالب ہو تو وہ اپنی تباہیوں اور آفتوں کا الزام مشیت الٰہی کے سر تھوپ دیتے ہیں اور واقعات کے اسباب و علل کی جستجو سے یہ کہہ کر پیچھا چھڑا لیتے ہیں کہ مشیت الٰہی یوں ہی تھی۔ کارکنان قضا و قدر کا فیصلہ یہی تھا۔ گویا کہ عالم تاریخ اور عالم فطرت میں کوئی اندھی بہری مشیت کارفرما ہے جس کا نہ کوئی اصول ہے اور نہ قانون و آئین۔

مشیت الٰہی اور قوانین تاریخ

اس میں شک نہیں کہ واقعات تاریخ اور حوادث فطرت میں ایک گہری مشیت کارفرما ہے جسے اہل مذہب مشیت الٰہی اور مادیین مشیت تاریخ کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ لیکن یہ مشیت اسباب وعلل کے واسطہ سے کام کرتی ہے اور اس کے مستقل قوانین ہیں جن کی وہ کبھی خلاف ورزی نہیں کرتی۔ یہ خیال بنیادی طور پر غلط ہے کہ مشیت الٰہی کوئی اندھی بہری قوت ہے جس کے اصول وقوانین غیر معین اور نامعلوم ہیں۔ قرآن حکیم نے اس غلط تصورِ مشیت کی پر زور تردید کرتے ہوئے بتایا ہے کہ خداوند تعالیٰ کا کوئی کام بلا سبب، بلا مصلحت نہیں ہوا کرتا کیوں کہ اس نے اس کائنات کو چند معینہ اصولوں پر بنایا ہے اور انھی اصولوں کی پابندی کر کے قومیں طبعی فطرت اور انقلابات تاریخ پر قابو پاسکتی ہیں۔ خدا کے غضب وانتقام اور اس کی خوشنودی اور رضامندی کا بھی ایک آئین اور ضابطہ ہے۔ یہ بات صحیح نہیں کہ خداوند تعالیٰ کسی قوم کو بلاوجہ اپنے انعامات واکرامات سے سرفراز کر دیتا ہے یا بغیر کسی قصور اور گناہ کے ان کو آفات ومصائب میں مبتلا کر دیتا ہے۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے:

وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرَىٰ إِلَّا وَأَهْلُهَا ظَالِمُونَ(۲۸:۵۹)

ہم کسی آبادی (قوم) کو ہلاک نہیں کرتے ہیں بجز اس کے کہ اس کے افراد ظالم ہوں۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرَىٰ بِظُلْمٍ وَأَهْلُهَا مُصْلِحُونَ(۱۱:۱۱۷)

تیرا رب کسی آبادی (قوم) کو ظلم کے ساتھ برباد نہیں کرتا ہے جبکہ اس کے افراد نیک کردار ہوں۔

ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً أَنْعَمَهَا عَلَىٰ قَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ (۸:۵۳)

اللہ تعالیٰ کسی قوم سے اپنی عطا کردہ نعمتیں نہیں چھینتا جب تک کہ وہ قوم اپنا عمل اور کردار خود

نہیں بدلتی۔

ان آیات میں یہ بتایا دیا گیا ہے کہ تاریخی واقعات وحوادث اور قوموں کے عروج وزوال اور عزت وذلت کے مظاہر افراد کے اپنے اعمال کا فطری نتیجہ ہیں۔ خدا کسی قوم کو اسی صورت میں برباد کرتا ہے یا یوں کہیے کہ قانون الٰہی اور قانون فطرت کسی قوم کو اس کی آزادی اور طاقت سے اسی وقت محروم کرتا ہے' جب وہ کمزوروں پر ظلم کرنے لگتی ہے۔ خواہ یہ کمزور لوگ کسی دوسری محکوم قوم کے افراد ہوں یا خود اسی قوم کے غریب اور بے سہارا لوگ ہوں۔ اسی طرح جس قوم کے اعمال اچھے ہوں اور جو قوم کمزور انسانوں کے حقوق کا احترام کرتی ہو یا قرآنی اصطلاح میں صالح ہو، اس کو خداوند تعالیٰ کسی مصیبت میں مبتلا نہیں کرتا۔ پھر قرآن کہتا ہے کہ اجتماعی اعمال کی جزا و سزا ایک بدیہی حقیقت ہے جس کا مشاہدہ تم تاریخ کے ہر عہد انقلاب میں کر سکتے ہو۔ اگر تم قوموں کے عروج وزوال اور عزت وذلت کا حقیقی سبب معلوم کرنا چاہتے ہو تو تاریخ کی ورق گردانی کرو۔ اور تم سے پہلے جو قومیں گزر چکی ہیں ان کا حال معلوم کرو:

فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِيْنَ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا o اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَكَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً (۳۵:۴۳۔۴۴)

ترجمہ : تو کیا یہ پہلے لوگوں کے طریق تباہی کے سوا اور کسی چیز کا انتظار نہیں کرتے۔ اور تو اللہ کے طریقہ میں کوئی تبدیلی نہیں پائے گا۔ اور تو اللہ کے طریقہ میں الٹ پھیر نہ پائے گا۔ کیا وہ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے پہلوں کا انجام کیا ہوا اور وہ ان سے قوت میں بہت زیادہ تھے۔

قرآن کریم نے یہاں مطالعہ تاریخ کے بجائے گزشتہ قوموں کا حال معلوم کرنے کے لیے سیر وسیاحت کے طریقہ کا ذکر کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ گزشتہ زمانے میں قوموں کی مفصل تواریخ مرتب نہیں تھیں اور ان کے تاریخی حالات معلوم کرنے کا یہی طریقہ تھا کہ لوگ ان مقامات کی سیر وسیاحت کریں جہاں پہلے یہ قومیں آباد تھیں۔ اس لیے قرآن کی عبارت میں سیر وسیاحت کے بجائے اگر مطالعہ تاریخ کے الفاظ رکھ دیے جائیں تو مطلب میں کوئی فرق نہ ہوگا۔ بہرحال قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ کسی ذریعہ سے تم واقعات تاریخ سے

واقفیت حاصل کرلو تو تمھیں محسوس ہوگا کہ اجتماعی جزا وسزا اور مکافات عمل کا تاریخی قانون ایک اٹل، مستقل اور نا قابل تغیر قانون ہے اور تاریخ کے اس قانون یا بالفاظ قرآن سنت الٰہی میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوتی ۔ چنانچہ جو قوم میں خوشحالی، عظمت وعزت کی بلندی سے محکومی، پستی اور ذلت میں مبتلا ہوتی ہیں، تو اس کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ خدا ان کی حالت کو بدل دیتا ہے بلکہ وہ اپنی روش اور طرز عمل میں خود تبدیلی پیدا کر کے اپنی ذلت و ناکامی کے اسباب فراہم کرتی ہیں ۔کوئی بڑھتی ہوئی قوم جن خدائی انعامات واکرامات سے سرفراز ہوتی ہے، وہ اس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مستفید ہو سکتی ہے ۔اگر اس کی وہ ابتدائی روش، وہ طرز فکر اور طریق حیات تبدیل نہ ہو، جو ان انعامات اور سرفرازیوں کا باعث تھا۔اس طرح قرآن اس نظریہ کو باطل قرار دیتا ہے کہ خدا کی مشیت کا کوئی اصول نہیں اور وہ بغیر کسی سبب وعلت یا مصلحت کے کوئی کام کرتا ہے یا یہ کہ وہ اپنی داد ودہش اور غضب وانتقام میں کسی ضابطہ اور آئین کا پابند نہیں ہے ۔اور اگر ہے تو انسان اس ضابطہ کو معلوم کرنے سے عاجز ہے ۔ پھر قرآن کے اس دعویٰ سے کہ ہم کسی قوم کی ترقی اور خوشحالی کو ذلت وپستی میں نہیں بدلتے ہیں، یہ امر بھی مستنبط ہوتا ہے کہ تاریخ کی تبدیلیاں اور اجتماعی انقلابات وحوادث براہ راست خدا کی مرضی سے ظہور پذیر نہیں ہوتے ہیں بلکہ ان انقلابات وتغیرات کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے جس کا سراغ انسان کو خود اپنے اعمال میں تلاش کرنا چاہیے۔

جو لوگ تاریخی انقلابات اور قوموں کے عروج وزوال اور عظمت وذلت کو وقتی حالات اتفاقی حوادث، جغرافیائی عوامل یا خداوند تعالیٰ کی نامعلوم مشیت پر محمول کرتے ہیں وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ خود اپنی زندگی کے روز مرہ واقعات میں وہ خدا کی نامعلوم مشیت پر بھروسہ کرنے کے بجائے ان واقعات کے اسباب وعلل کی جستجو کرتے ہیں اور پھر اپنے مفید مطلب اسباب ووسائل فراہم کر کے نقصان سے محفوظ رہنے اور کامیابی کرنے کی جدوجہد کرتے ہیں ۔ مثلاً جب ہم کسی بیماری میں مبتلا ہو جاتے ہیں تو ہم یہ کہہ کر بیٹھ نہیں رہتے کہ خدا کی مشیت یوں ہی تھی ۔ اس کے بجائے ہم اپنے اسباب مرض کی تلاش کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ کہیں ہم نے بد پرہیزی تو نہیں کی تھی ۔ اصول حفظان صحت کی خلاف ورزی کا

ارتکاب تو ہم سے نہیں ہوا۔ پھر جب غور وفکر کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ہماری علالت اور جسمانی تکلیف کی اصل علت یہ تھی کہ ہم نے فلاں فلاں اصول صحت کے خلاف عمل کیا ہے، ہمارے سونے اور اٹھنے، بیٹھنے اور کام کرنے کے اوقات ٹھیک نہ تھے، یا ہم نے غذاؤں کے انتخاب میں غلطی کی ہے تو اس وقت ہم اپنی روش اور طرز عمل میں تبدیلی پیدا کر کے ازالہ مرض کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمارے مکان کا کوئی کمرہ دفعتہً گر جاتا ہے تو ہم یہ نہیں کہتے کہ خدا نے اسے گرا دیا یا اللہ کی مشیت یونہی تھی، اس کے بجائے ہم فوراً سوچتے ہیں کہ جس انجینیئر نے مکان کا نقشہ مرتب کیا تھا، اس کے حساب میں کوئی غلطی رہ گئی ہوگی یا تعمیر مکان کا انتظام جن لوگوں کو سپرد تھا، انہوں نے انجینیئر کے مرتب کردہ نقشہ کے مطابق کام نہیں کیا یا کہ کہ منتظمین نے تعمیر مکان کے لیے سامان خریدنے میں کچھ خیانت کی ہوگی اور گھٹیا قسم کا مال استعمال کیا ہوگا غرض کہ معمولی واقعات پر جن کا ہماری شخصی یا خاندانی زندگی سے تعلق ہوتا ہے، ہم اس طرح غور نہیں کرتے ہیں کہ گویا یہ کسی نامعلوم مشیت کا نتیجہ ہیں، بلکہ ان کے اسباب وعلل کی جستجو کر کے ہم ان واقعات کا رخ بدلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن قومی زندگی کے اتار چڑھاؤ، تاریخ کے واقعات وحوادث اور اپنے ملکی انقلابات اور اجتماعی مصائب کے بارے میں ہم ایک بالکل مختلف طرز فکر اختیار کرتے ہیں اور اپنی غلطیوں، خطاؤں اور فروگزاشتوں کا جائزہ لینے کے بجائے ہم یہ کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ خدا کی مشیت یوں ہی تھی۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ صاف الفاظ میں ارشاد فرماتا ہے:

ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ یَکُ مُغَیِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰی قَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ

(۸:۵۳)

یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ان نعمتوں کو کسی قوم سے کبھی نہیں چھینتا جو اسے اللہ کی طرف سے ملی ہوں جب تک کہ وہ قوم خود اپنے عمل اور کردار کو نہ بدل دے۔

پس معلوم ہوا کہ واقعات تاریخ اور انقلابات عالم انسان کے اپنے اعمال کا براہ راست نتیجہ ہیں نہ کہ اللہ تعالیٰ کی مداخلت کا۔ تاریخ خود اپنے مستقل قوانین رکھتی ہے، جن میں سب سے بڑا اور بنیادی قانون مکافات عمل کا ہے یعنی اجتماعی اعمال کے نتائج خواہ وہ برے ہوں یا اچھے، اپنے مقررہ وقت پر ضرور ظاہر ہوتے ہیں۔ جس طرح فطرت مادی میں حفظ توانائی اور

حرکت کے قانون کے مطابق کوئی مادی شے یا ذراتی حرکت ضائع نہیں ہوتی اسی طرح فطرت اجتماعی اور عالم روحانی میں انسان کا کوئی اچھا یا برا عمل بے اثر اور بے نتیجہ نہیں رہتا، بلکہ ہر عمل کا نتیجہ ایک خاص وقت ضرور ظاہر ہوتا ہے۔ کیوں کہ فطرت میں کہیں ضیاع نہیں۔ چنانچہ قرآن جس طرح اعمال بد کے نتائج سے ڈراتا اور یہ یقین دلاتا ہے کہ بدی کے نتائج سے بچنا محال ہے اسی طرح اس کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ نیک اعمال اور اعلیٰ اجتماعی کردار بھی بے نتیجہ نہیں ہوسکتا اور کوئی اچھی قوم اپنی صالح جدوجہد کے عمدہ نتائج یا اس کے اجر سے محروم نہیں رہے گی:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیۡعُ اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ (۹:۱۲۰)

اللہ تعالیٰ نیکی کرنے والوں یعنی صالح قوم کا اجر ضائع نہیں کرتا ہے۔

وَلَوۡ اَنَّ اَہۡلَ الۡقُرٰۤی اٰمَنُوۡا وَ اتَّقَوۡا لَفَتَحۡنَا عَلَیۡہِمۡ بَرَکٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الۡاَرۡضِ وَ لٰکِنۡ کَذَّبُوۡا فَاَخَذۡنٰہُمۡ بِمَا کَانُوۡا یَکۡسِبُوۡنَ (۷:۹۶)

اگر ان آبادیوں کے باشندے ایمان لاتے اور خدا کے قانون جزا و سزا سے ڈرتے رہتے تو ہم آسمان سے ان پر برکتیں نازل کرتے۔ لیکن انھوں نے خدا کے قانون جزا و سزا کا انکار کیا تو ہم نے انھیں ان کاموں پر سزا دی جو وہ کیا کرتے تھے۔

ان دونوں آیات میں قرآن کریم نے قوانین تاریخ کی نہایت جامع اور مکمل الفاظ میں توضیح کردی ہے۔ اوّلاً وہ کہتا ہے کہ اچھے اعمال کے نتائج اسی دینوی زندگی میں تمھارے سامنے آجاتے ہیں۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نیک کرداری اور حسن عمل کے نتائج کو ضائع نہیں کرتا۔ اگر لوگوں کا عقیدہ صحیح ہو یعنی وہ انسان کی اجتماعی فطرت کا صحیح علم رکھتے ہوں، حقیقت حیات سے آگاہ اور باخبر ہوں نیز قانون مکافات عمل کی خلاف ورزی کے نتائج کا خوف بھی ان میں موجود ہو جسے قرآن اپنی اصطلاح میں تقویٰ کہتا ہے تو یہ ناممکن ہے کہ وہ زوال و انحطاط یا ذلت و نکبت میں مبتلا ہو جائیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ انھیں زمین و آسمان کی برکات یعنی مادی وسائل کی فراوانی سے مالا مال اور خوش حال کردے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ قومی عظمت و کامیابی اور خوش حالی قوم کے اجتماعی عمل کا نتیجہ ہے نہ کہ اندھی بہری تقدیر کا۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ کائنات اور انسانی زندگی کی تعمیر اللہ تعالیٰ نے قانون اخلاق پر کی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ انھی قوموں کو دنیوی عزت و سربلندی اور حکومت و طاقت سے سرفراز فرماتا ہے جن

کا وجود پسماندہ اقوام اور مظلوم طبقات کے لیے فائدہ مند ہو۔ جو اپنی عقلی ترقی، سائنٹفک برتری، اپنے عدل وانصاف اور جذبہ احترام انسانیت کے باعث پست اور ذلیل قوموں نیز پسماندہ طبقات کو رفعت و بلندی کی طرف لے جاسکیں، اور اخلاقی یا تمدنی حیثیت سے انھیں آگے بڑھا سکیں۔ ظالم اور عیش پرست قومیں اپنی ناانصافیوں اور راحت طلبی کی وجہ سے انسانیت کو آگے بڑھانے کے بجائے اسے پیچھے دھکیل دیتی ہیں۔ اس لیے قدرت ان کے وجود کو ایک بارِگراں سمجھ کر اپنی راہ سے ہٹا دیتی ہے۔ کیوں کہ اس کو انسانیت کا ارتقا مطلوب ہے نہ کہ اس کی پستی، چنانچہ اسی فلسفہ کو قرآن ایک جگہ ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَاءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ط وَ مِمَّا يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ اَوْمَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ ط كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَ الْبَاطِلَ ط فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ج وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ (۱۳ : ۱۷)

وہ آسمان سے پانی اتارتا ہے پھر نالے اپنے اپنے اندازے کے مطابق بہہ نکلتے ہیں پھر سیلاب اوپر تیرتے ہوئے جھاگ کو بہالے جاتا ہے اور زیور یا سامان بنانے کے لیے جو کچھ آگ میں تپایا جاتا ہے اس میں بھی اسی طرح جھاگ ہوتا ہے، اسی طرح اللہ حق اور باطل کی مثال دیتا ہے سو جھاگ تو ضائع کر دیا جاتا ہے مگر وہ پانی جو لوگوں کو نفع پہنچاتا ہے، زمین میں باقی رہتا ہے۔

قرآن کریم نے یہاں کنایۃً یہ بتا دیا ہے کہ وہی قومیں دنیا میں بقا و استحکام اور شرف و عزت حاصل کرتی ہیں جن سے عامہ انسانیت کو نفع پہنچے، اور جن کا وجود نفع خلائق کا موجب ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسی قومیں وہی ہوں گی جو عقل وخرد سے بہرہ ور اور جذبہ انسانیت سے معمور ہوں۔ جو عیش وراحت سے کنارہ کش اور جفاکشی اور محنت ومشقت، فعالیت اور حرکت پذیری کی صفات سے متصف ہوں۔ یہی وہ اخلاقی قانون ہے جو ساری تاریخ کی تشکیل کرتا ہے اور جس کے مطابق قوموں کو عروج وترقی یا ذلت ونکبت نصیب ہوتی ہے۔ جو قومیں اس قانون کے مطابق شعوری طور سے یا غیر شعوری طریقہ سے عمل کرتی ہیں ان کو اس کا انعام ملتا ہے اور جو

اس کی خلاف ورزی کرتی ہیں، انھیں اپنے کیے کی سزا ملتی ہے۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے کہ ہم نے اہل قریٰ (بستیوں والوں) سے جو موخذاہ کیا وہ انھیں کے کسب (عمل) کا نتیجہ تھا، اگر ان میں محنت و مشقت، جدوجہدٔ عدل و انصاف اور دوسری منفعت بخش صفات ناپید نہ ہو جاتیں اور وہ تقویٰ یعنی قانون مکافات عمل کے نتائج کے خوف سے عاری نہ ہو جاتے تو ان کی مادی خوشحالی اور دنیوی عزت کا دور ختم نہ ہوتا۔ خدا کو ان کے ساتھ کوئی خصومت نہ تھی بلکہ ان کی تباہی قانون تاریخ کے مطابق عمل میں آئی۔ اسی حقیقت کو قرآن یوں بھی بیان کرتا ہے:

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ (۲: ۱۳۴)

گزری ہوئی اُمتوں کے لیے وہ تھا جو انھوں نے حاصل کیا اور تمھارے لیے وہ ہوگا جو تم حاصل کرو گے۔

اس آیت سے ہمارے اس دعویٰ کی مزید تصدیق ہوتی ہے کہ قرآن کی نظر میں قوموں کی فلاح و ترقی اور زوال و ناکامی ان کے اعمال کا فطری نتیجہ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ براہ راست کسی قوم کی تقدیر کو نہ بناتا ہے نہ بگاڑتا ہے۔ البتہ یہ بات صحیح ہے کہ مکافات عمل کا قانون جس کے مطابق اعمال کے نتائج ظاہر ہوتے ہیں، اللہ ہی کا بنایا ہوا قانون ہے، اس لیے اس قانون کے عمل کو اللہ تعالیٰ اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔ چنانچہ جب وہ کہتا ہے کہ ہم جسے چاہتے ہیں عزت دیتے ہیں اور جسے چاہتے ہیں ذلت وَتُعِزُّ مَن تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَن تَشَاءُ (۳: ۲۶) تو اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ ہمارے بنائے ہوئے قانون فطرت اور قانون اخلاق کے مطابق جو قوم عمل کرتی ہے اس کا انجام اچھا ہوتا ہے اور وہ عزت و عظمت کی زندگی بسر کرتی ہے، اس کے برخلاف جو قوم قانون فطرت اور قانون اخلاق کی خلاف ورزی کرتی ہے اسے ذلت اور ناکامی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس آیت کا عام طور پر مفہوم یہ سمجھا جاتا ہے کہ خداوند تعالیٰ بغیر کسی سبب اور بلا کسی علت کے جس قوم کو چاہتا ہے معزز کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلیل کرتا ہے۔ حالانکہ یہ مفہوم دوسری آیات کی روشنی میں بالکل غلط ہے۔ اصل یہ ہے کہ قوموں کا عروج و زوال اور ان کا ذلیل یا عزت دار ہونا ایک فطری قانون کے تابع ہے اور اس قانون کے عمل میں اللہ تعالیٰ براہ راست کبھی مداخلت نہیں کرتا۔

الغرض قرآن کے نزدیک واقعات تاریخ میں ایک تسلسل، وحدت اور باہمی ربط و علاقہ ہے اور تاریخ بے ربط اور بے معنی واقعات کا مجموعہ ہے۔ بلکہ اس کا ہر واقعہ اپنے پیش رو واقعات سے تشکیل پاتا ہے۔ علت و معلول کے طبعی قانون کی طرح عالم تاریخ میں بھی اسباب و نتائج کا قانون کام کرتا رہتا ہے۔ البتہ طبعی فطرت کے واقعات مادہ یعنی بے جان اشیا کے خواص و صفات سے ظہور پذیر ہوتے ہیں اور عالم تاریخ کے واقعات انسان کی اجتماعی فطرت سے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر انسانی فطرت کے قوانین کا ہمیں صحیح علم ہو تو ہم واقعات تاریخ کی توجیہہ صحیح طور سے کر سکتے ہیں اور اگر انسانی فطرت کی خصوصیات و صفات کے متعلق ہمارے تصورات ناقص یا غلط ہوں تو ہم اجتماعی واقعات اور تاریخی انقلابات کی جو توجیہہ کریں گے وہ بھی اسی درجہ میں ناقص یا غلط ہو گی۔ چنانچہ انسان کی اجتماعی فطرت کے بارے میں جس قوم اور گروہ کا تصور حقیقت سے جتنا قریب تر ہوتا ہے واقعات کے اسباب و نتائج پر اس کی نظر بھی اتنی ہی صحیح ہوتی ہے اور اسی درجہ میں اس کو یہ قدرت بھی حاصل ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے اجتماعی اعمال کا جائزہ لے کر ان کی اصلاح کرے، اس کے برخلاف جو گروہ جس درجہ میں انسانی فطرت کے صحیح تصور سے عاری ہوتا ہے اسی قدر اس کا کردار اور عمل قانون اخلاق کے منافی ہوتا ہے اور اسی حد تک وہ اپنے اعمال کی اصلاح و درستگی میں بھی ناکام رہتا ہے۔ اس طرح تاریخی انقلابات کا تار و پود قوموں کے اجتماعی اعمال سے بنتا ہے اور ان اعمال کا دارومدار اس پر ہے کہ قوم کا تصور حقیقت ٹھیک ہو، انسان کی اجتماعی فطرت کے بارے میں وہ صحیح نقطہ نظر اختیار کرے اور اپنے اعمال کی اصلاح و تحسین میں وہ اس فطرت کے تقاضوں کو مدنظر رکھے۔ قرآن انھی دونوں کو ایمان اور عمل صالح سے موسوم کرتا ہے ایمان کے معنی یہ ہیں کہ حقیقت حیات کے بارے میں (جس میں انسان کی اجتماعی فطرت بھی شامل ہے) ہمارا عقیدہ اور نظریہ صحیح ہو اور عمل صالح یہ ہے کہ حقیقت حیات اور فطرت اجتماعی کے صحیح نظریہ کو مان کر اور غلط تصورات سے دستبردار ہو کر ہم اپنے اجتماعی اعمال کو اس اجتماعی نظریہ اور سچے عقیدہ پر ڈھالنے کی کوشش کریں۔

قرآن اور فطرت اجتماعی

اب سوال یہ ہے کہ قرآن اور اسلام انسان کی اجتماعی فطرت کے بارے میں کیا نظریہ قائم کرتا ہے۔ اگر یہ نظریہ صحیح ہے تو واقعات تاریخ کی قرآنی توجیہہ بھی صحیح ہوگی ورنہ نہیں۔ کیونکہ تاریخ انسان کی فطرت اجتماعی کا آئینہ ہے اور اس کے تمام واقعات وانقلابات اسی فطرت کے تخم سے پھوٹتے اور بڑھتے ہیں۔ اس ضمن میں قرآن کا پہلا دعویٰ یہ ہے کہ فطرت انسانی فطرت الٰہی پر مبنی اور غیر متغیر ہے۔ یعنی باوجود تغیر حالات اور ترقی تمدن اس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی ہے:

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ (۳۰:۳۰)

اس سے دو باتیں مستنبط ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ چونکہ انسانی فطرت فطرت الٰہی کا عکس اور پرتو ہے۔ اس لیے اس میں لامحدودیت اور علو کی جانب ایک قوی میلان پایا جاتا ہے یعنی انسان جس چیز کی طلب وآرزو کرتا ہے اس کی کوئی آخری حد نہیں ہوتی جہاں اس کا قدم آکر ٹھہر جائے:

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشت امکان کو ایک نقش پا پایا

مال دولت کی ہوس ہو۔ اقتدار وطاقت کی خواہش ہو۔ خدمت خلق کا جذبہ ہو۔ فضیلت علمی کا ولولہ ہو یا فضیلت روحانی کی امنگ غرض کہ کوئی بھی مادی یا غیر مادی نصب العین ہو اس کا نشان منزل اور حد سفر غیر متعین ہے۔ انسانی خواہشات اور آرزوؤں کی لامحدودیت فطرت بشری کو فطرت آگہی سے ہم کنار کرتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ زندگی کی ساری تعمیر وتخریب، تمام ترقی وپستی، صلاح وفساد اور خیر وشر کی آویزش چونکہ اسی علوی

فطرت اور لامحدودیت کا نتیجہ ہے، اس لیے دنیا میں باہمی تصادم اور اجتماعی کشاکش کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا۔ اور انسانیت پر ایسا کوئی دور نہیں آئے گا جب ساری نوع بشر ایک مشترکہ مرکز پر جمع ہو جائے کیوں کہ اگر تمام دنیا کبھی ایک نصب العین، ایک مقصد، ایک تخیل یا ایک مشترکہ عقیدہ کو مان لے تو انسانی ترقی کی رفتار سست پڑ جائے، بلکہ ارتقائے ہستی بالکل معدوم ہو جائے۔ حالانکہ فطرت انسانی جو فطرت الٰہی کی لامحدودیت اور علوی غیر متناہی کا عکس و پرتو ہے، ارتقائے لامحدود اور غیر منفصل ترقی کے تقاضے سے معمور و مجبور ہے، اسی حقیقت کو قرآن نے یوں بھی بیان کیا ہے:

وَلَوْ شَآءَ رَبُّکَ لَاٰمَنَ فِی الْاَرْضِ کُلُّهُمْ جَمِیْعًا ط اَفَاَنْتَ تُکْرِهُ النَّاسَ حَتّٰی یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ (۱۰:۹۹)

اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو زمین پر بسنے والے تمام انسان ایمان لے آتے کیا تو لوگوں کو مجبور کرنا چاہتا ہے کہ سب ایمان لے آئیں۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَی الْهُدٰی (۶:۳۵)

اگر اللہ چاہتا تو وہ سب کو ایک مرکز ہدایت پر جمع کر دیتا۔

لِکُلٍّ جَعَلْنَا مِنْکُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا (۵:۴۸)

ہم نے تم میں سے ہر قوم و جماعت کے لیے ایک قانون اور طریقہ بنا دیا ہے۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَهُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰکِنْ یُّدْخِلُ مَنْ یَّشَآءُ فِیْ رَحْمَتِهٖ ○ (۴۲: ۸)

اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو وہ ان سب کو ایک ہی امت بنا دیتا لیکن وہ جس کو چاہتا ہے اپنے دائرہ رحمت میں داخل کر لیتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ چونکہ انسانی اختلافات اور آویزشیں بالآخر انسانیت کی مجموعی ترقی کا باعث ہیں، اس لیے دنیا میں ہمیشہ کم سے کم دو مقابل گروہ ضرور باقی رہیں گے اور ایسا کبھی نہ ہوگا کہ ایک واحد نظام زندگی سارے عالم پر چھا جائے۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی

بہتر نظام حیات زمین کے غالب حصہ پر نافذ اور کارفرما ہو۔ چنانچہ اس طرز خیال کی مزید تصدیق قرآن کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے جس میں آدم علیہ السلام کے جنت سے نکالے جانے کا ذکر کیا گیا ہے:

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ وَ قُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ (۳٦:۲)

پس ان دونوں کو شیطان نے پھسلا دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے مقام سکونت سے نکال دیئے گئے اور ہم نے ان سے کہا زمین پر اتر جاؤ جہاں (تمہاری اولاد) ایک دوسرے کی دشمن ہوگی۔

یعنی جب سے شیطان نے انسان کی علوی فطرت اور لامحدودیت کا رخ نیکی کے بجائے بدی کی جانب موڑ دیا اس وقت سے انسان امن و عافیت کی زندگی سے محروم ہوگیا جسے قرآن جنت کے نام سے موسوم کرتا ہے نیز اسی باعث انسانیت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مختلف گروہوں میں منقسم ہوگئی جن میں سے ہر گروہ دوسرے کا مخالف ہے۔ اگر آدم علیہ السلام کی علوی فطرت کا رخ ٹھیک رہتا تو یہ باہمی آویزش، کشاکش اور پیکار و مسابقت معرض وجود میں نہ آتی اور انسانیت ایک متحدہ مرکز پر جمع رہتی۔ لیکن اب تا قیامت انسان ایک دوسرے کے حریف اور مدمقابل رہیں گے پھر اسی کشمکش اور تصادم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن مجید یہ بھی فرماتا ہے:

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ (۲۵۱:۲)

اگر اللہ تعالیٰ بعض انسانوں کو دیگر انسانوں کے ذریعے دفع نہ کرتا رہتا تو زمین میں فساد پھیل جاتا۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا (۴۰:۲۲)

اگر اللہ (تعالیٰ) بعض گروہوں کو دیگر گروہوں کے ذریعے دفع نہ کرتا رہتا تو دیر و خانقاہ اور مساجد جن میں اللہ کا نام کثرت سے لیا جاتا ہے مسمار ہو جاتیں۔

یعنی تاریخ کی وہ کشمکش جو قوموں اور گروہوں میں ہمیشہ سے جاری ہے اور جاری

رہے گی اور جس کا سرچشمہ وہی علوی فطرت اور لامحدودیت کا انسانی میلان ہے، خالصۃً شر اور فساد کا باعث نہیں بلکہ وجہ خیر بھی ہے کیونکہ اگر کسی گروہ یا قوم کو غیر متعین مدت کے لیے زمین پر غالب رہنے دیا جائے تو نہ صرف ظلم وفساد کی پرورش ہوگی بلکہ انسانی ضمیر و مذہب کی آزادی کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ اس طرح قرآن کی نظر میں تاریخی انقلابات اور اقوام و امم کی باہمی آویزشیں رفع فساد کا ذریعہ اور ارتقائے انسانیت کا وسیلہ ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر انسان کی اجتماعی فطرت ایک غیر تغیر پذیر حقیقت ہے تو اس کی بنیادی خصوصیات کیا ہیں جن کا مظاہرہ ہر زمانہ اور ہر دور کے تاریخی واقعات میں ہوا کرتا ہے اور جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انقلابات عالم اور واقعات تاریخ حقیقتاً انسانی فطرت کی غیر متغیر خصوصیات سے صادر ہوتے ہیں۔ فطرت اجتماعی کی ایک خصوصیت کا ذکر تو ہم اوپر کر چکے ہیں یعنی انسانی خواہشات اور حوصلوں کی لامحدودیت جبکہ دوسری خصوصیت قرآن کریم نے یہ بتائی ہے کہ خدا نے سب انسانوں کو مساوی نہیں پیدا کیا بلکہ بعض کو بعض پر فضیلت اور برتری دی ہے، چنانچہ جس طرح بنی آدم کو دوسری مخلوقات پر فضیلت حاصل ہے اسی طرح نوع انسانی میں بھی مختلف صلاحیتوں کے افراد اور مختلف صفات کی قومیں پائی جاتی ہیں۔

چنانچہ قرآن کہتا ہے:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا (۱۷:۷۰)

اور ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور انھیں اپنی اکثر مخلوقات پر فضیلت عطا فرمائی۔

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰكُمْ (۶:۱۶۵)

وہی ہے جس نے تمھیں زمین پر خلیفہ مقرر کیا اور تم میں سے بعض کو بعض پر بلند کیا تاکہ جو فضیلت تمھیں دی گئی ہے اس میں وہ تمھیں آزمائے۔

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ (۱۶:۷۱)

اللہ ہی ہے وہ جس نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں فضیلت دی ہے۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ مِنْهُمْ (۲:۲۵۳)

یہ رسول ہیں جن میں سے بعض کو ہم نے بعض پر فضیلت دی۔

اس سے معلوم ہوا کہ تاریخ کے ہر دور میں انسانوں کی یہ خصوصیت نمایاں رہے گی کہ ان میں علم و فضل، مال و دولت، قوت و اقتدار اور دیگر صلاحیتوں کے اعتبار سے فرق ہوگا اور اس فرق کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ جو فرد یا قوم جس اعتبار سے دوسروں پر افضل ہے اس کا فائدہ اسے ضرور پہنچے گا لیکن فرق مراتب اور افضلیت کی اس خصوصیت میں افراد اور اقوام کے لیے ایک آزمائش بھی ہے۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے کہ ہم نے تم میں سے بعض کو بعض پر جو فضیلت عطا کی ہے اس سے تمھاری آزمائش مقصود ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ افراد و اقوام کو ایک دوسرے پر جو فوقیت دی گئی ہے، اس سے قدرت کا منشا یہ نہ تھا کہ ایک انسان دوسرے پر اور ایک قوم دوسری قوم پر اپنی خدائی کا سکہ جمائے، اس کی محنت و مشقت یا اس کے وسائل سے اپنے لیے فوائد حاصل کرے اور پھر اس کے ساتھ ذلت اور حقارت کا برتاؤ کرے۔ بلکہ یہ فضیلت اور برتری افراد و اقوام کو اس لیے دی گئی تھی کہ وہ اس سے خلق خدا کو نفع پہنچائیں۔ چنانچہ جو افراد یا قومیں اپنی فطری فضیلت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر کمزور افراد یا اقوام سے استحصال کرنے لگتی ہیں، ان کے خلاف ایک عام جذبہ نفرت پیدا ہو جاتا ہے بہر صورت اس فضیلت کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہے کہ تاریخ کے کسی دور میں نہ تو عام افراد انسانی کے مابین کامل مساوات رہ سکتی ہے اور نہ کسی زمانہ میں جملہ اقوام عالم تمدن و معیشت اور ارتقا کی ایک ہموار سطح پر آسکیں گی بلکہ ہر زمانہ میں غالب و مغلوب اقوام رہیں گی اور ہر دور میں بعض انسان کمزور اور بعض قوی ہوں گے۔ اس قدرتی فرق مراتب کا ایک فائدہ بھی ہے اور نقصان بھی فائدہ یہ ہے کہ کم تر فضیلت رکھنے والے افراد اور قومیں اپنے سے بہتر افراد اور قوموں کی تقلید کر کے محنت و مشقت اور جدوجہد کے ذریعے ان کی سطح تک پہنچنا چاہتی ہیں۔ اس طرح افراد اور قوموں میں ایک جذبہ مسابقت پیدا ہوتا ہے جس سے انسانیت ترقی کی جانب قدم بڑھاتی ہے۔ نقصان یہ ہے کہ بعض افراد و اقوام اپنے سے بہتر

افراد اور قوموں کی حالت پر رشک وحسد کرنے لگتی ہیں اور ان کے فضائل اخلاق کو اپنانے کی ایجابی کوشش کے بجائے اس منفی کوشش میں اپنا وقت اور اپنی توانائیاں صرف کرتے ہیں کہ دوسروں کو ان فوائد سے محروم کر دیں جو ان کی فطری فضیلت کے باعث انھیں حاصل ہیں اسی خطرہ کو رفع کرنے کے لیے قرآن کریم فرماتا ہے:

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ (۴:۳۲)

اور اللہ تعالیٰ نے تمھیں ایک دوسرے پر جو فضیلت دی ہے اس پر رشک وحسد نہ کرو۔

یعنی قدرت نے مادی وسائل، علم وفضل، حسن صورت، جسمانی طاقت یا اور کسی اعتبار سے ایک فرد کو دوسرے فرد پر اور ایک قوم کو دوسری قوم پر جو فضیلت دی ہے اس پر رشک و حسد نہیں کرنا چاہیے کیوں کہ ایسے رشک وحسد کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو فرد یا قوم کسی مخصوص فضیلت سے عاری ہو وہ برتر افراد یا اقوام کو ان کی فضیلت کے فوائد سے محروم کر دینا چاہتی ہے جس سے باہمی فساد اور خونریزی کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔ اس طرح قرآن حکیم نے انسان کی اجتماعی فطرت کی ایک اور بنیادی خصوصیت کی طرف اشارہ کیا ہے جو تاریخی واقعات اور انقلابات ملکی وقومی میں کارفرما رہتی ہے۔ یعنی دوسرے افراد اور قوموں کو ان کی فطری فضیلت اور سعی وکوشش کے فوائد سے محروم کر دینے کی کوشش لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیے۔ کہ اس قسم کی منفی کوششیں بالعموم اسی وقت عمل میں آتی ہیں جب برتر افراد و اقوام اپنی فضیلت سے ناجائز فائدہ اٹھانے لگتی ہیں اور انسانیت کی خدمت کرنے کے بجائے کمزوروں پر اپنی برتری کا سکہ جمانا چاہتی ہیں، چنانچہ آج کل سرمایہ داروں کے خلاف جو عام جذبہ نفرت پیدا ہو گیا ہے۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ ہمارا متمول اور دولت مند طبقہ اپنی مالی فضیلت کا غلط استعمال کر رہا ہے۔ اسی طرح امریکہ کے خلاف ایشیا اور دنیا کے دوسرے حصوں میں جو نفرت بڑھ رہی ہے۔ اس کا سبب بھی یہی ہے۔ اگر امریکہ اپنی دولت و ثروت کے ذریعہ انسانیت کی کوئی مفید خدمت انجام دیتا تو کوئی قوم اس سے بغض وعناد نہ رکھتی لیکن چونکہ اس فضیلت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر وہ اقوام عالم پر اپنی معاشی اجارہ داری

اور سیاسی بالادستی قائم کرنا چاہتا ہے اور ایشیائی ممالک کو جو معاشی امداد دیتا ہے اس کی غرض یہ ہوتی ہے کہ ان ملکوں کی حکومتیں سرمایہ داروں کے سیاسی مفاد کی حفاظت کریں اور امریکہ کی دست نگر اور محکوم رہیں۔ اس لیے دوسری قوموں کو بجا طور سے امریکہ اور اس کے ساتھیوں سے نفرت پیدا ہوگئی ہے۔ یہی بات ایک قوم کے مختلف افراد پر بھی صادق آتی ہے۔ اگر ہمارے سیاسی لیڈر، ہمارے عہدہ داران نظم ونسق، ہمارے متمول اشخاص، ہمارے اہل قلم اور صحافی اپنی مخصوص فضیلتوں کو قوم کی خدمت کے کام میں لگائیں تو قوم ان کی دل سے عزت کرے گی۔ لیکن چونکہ اس فضیلت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر وہ دوسرے کمزور انسانوں پر اپنا تفوق قائم کرنا چاہتے ہیں، ان کے مقابلہ میں متکبرانہ طرز عمل اختیار کر کے ان کے ساتھ تذلیل وتحقیر سے پیش آتے ہیں اس لیے ان کے خلاف قوم کے مظلوم افراد میں ایک جذبہ عناد پیدا ہو رہا ہے۔ قرآن کا نظریہ فضیلت ہمیں سکھاتا ہے کہ افراد کا ایک دوسرے پر تفوق استحصال اور ظلم کے لیے نہیں ہے بلکہ اس لیے ہے تاکہ برتر اور فائق افراد کمتر اور کمزور افراد کی خدمت کریں اور ان کی سطح کو بلند کرنے کی کوشش کریں۔ اسی طرح طاقتور اور غالب اقوام کو ان کی فضیلت کے باعث جو اقتدار وتسلط حاصل ہوتا ہے۔ اس سے بھی قدرت کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ وہ انسانیت کے پسماندہ حصوں کو ابھاریں اور غیر ترقی یافتہ قوموں کو اپنی سطح پر لانے کی کوشش کریں۔ جب افراد اور اقوام اپنے اس مشن سے غافل ہو کر اپنی مادی، تہذیبی یا علمی فضیلت کا غلط استعمال کرتے ہیں اور کمزور افراد واقوام پر دست تعدی دراز کرتے ہیں، تو ان کے خلاف ایک عام جذبۂ نفرت پیدا ہو جاتا ہے جو کبھی فوجی بغاوتوں کی صورت میں نمودار ہوتا ہے کبھی سیاسی سازشوں کی شکل اختیار کرتا ہے اور کبھی کمیونزم کے لباس میں منظر عام پر آتا ہے۔

اس کے بعد قرآن فطرت اجتماعی کی ایک اور خصوصیت کا تذکرہ کرتا ہے جو تہذیبی انقلابات کی تاریخ میں بہت نمایاں ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے:

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَ الْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ

مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ۝ قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادِ ۝ اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَ الْقٰنِتِيْنَ وَ الْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ (۳:۱۴-۱۷)

لوگوں کے لیے زینت رکھی گئی ہے عورتوں، لڑکوں اور چاندی سونے کے اکٹھے کیے ہوئے ڈھیروں اور نشان کیے ہوئے گھوڑوں، چوپایوں اور کھیتیوں کی محبت میں، یہ تو دنیوی زندگی کی متاع ہے اور اللہ کے یہاں اس سے بہتر پناہ گاہ ہے کہو کیا میں اس سے بہتر مقصد زندگی کی طرف تمھیں متوجہ کروں ان لوگوں کا مقصد جو اللہ کے قانون مکافات عمل سے ڈرتے ہیں اور جن کے لیے ان کے رب کے پاس باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے پاک وصاف بیویوں کے ساتھ اور اللہ کی رضا اور خوشنودی سے سرفراز ہو کر اور اللہ اپنے بندوں کے اعمال کی پوری طرح خبر رکھنے والا ہے وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہم ایمان لائے تو ہمارے گناہوں کو معاف فرما اور ہمیں آگ کے عذاب سے محفوظ رکھ۔ صبر کرنے والے، اپنے قول کو سچ کر دکھانے والے، فرمانبرداری کرنے والے، اپنے مقصد کے لیے مال ودولت خرچ کرنے والے اور پچھلی راتوں میں خدا سے استغفار کرنے والے ہیں۔

اس آیت میں قرآن کریم نے بتایا ہے کہ دنیا کے بیشتر افراد واقوام مادی وسائل حیات اور زندگی کی ظاہری زینتوں کو اپنا مقصد زندگی قرار دے کر ان کے حصول کی تگ و دو میں مصروف رہتے ہیں یعنی انسان پر تملیکی جبلتوں کا اثر زیادہ وسیع اور قوی ہوتا ہے۔ چنانچہ تاریخ کی اکثر وبیشتر لڑائیاں اور انقلابات میں انسان کی یہ اجتماعی خصوصیت پورے طور سے کارفرما رہتی ہے۔ اگرچہ ہر زمانہ میں مقابل گروہ اور برسر پیکار طبقات اپنے مقاصد کو اخلاق و مذہب

اور اعلیٰ روحانی اقدار کا رنگ دینا چاہتے ہیں اور نہایت خوش نما الفاظ و اصلاحات میں ان کی توضیح کرتے ہیں لیکن اگر ان گروہوں اور طبقوں کی نفسیات کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کی جدوجہد اور آویزش دنیوی مال و متاع، اسباب و زینت و آرائش اور سامان عیش کے حصول کے لیے ہوتی ہے۔ اس کے بالمقابل قرآن ایک اور مقصد بھی پیش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ تم ایک بہتر نصب العین کی جدوجہد بھی کر سکتے ہو اور وہ یہ کہ تملیکی مقاصد کے بجائے تخلیقی مقاصد کے لیے کوشش کرو۔ پھر وہ اس مختصر جماعت اور قلیل التعداد گروہ کی صفات و خصوصیات بیان کرتا ہے جو زندگی کے اعلیٰ اقدار اور تخلیقی مقاصد کے لیے سرفروشی کرتا ہے اور دوسروں سے کچھ لے لینے کے بجائے انھیں اپنے پاس سے کچھ دے دینے کا متمنی رہتا ہے ۔تاریخ کے انقلابی دور میں ایسی ہی مختصر تخلیقی جماعتیں اور ایسے ہی کم تعداد مجاہدین جو مال و دولت حاصل اور جمع کرنے کے بجائے اپنی تھوڑی بہت پونجی بھی اعلیٰ تر مقاصد کے لیے کھو بیٹھتے ہیں ظالموں، استحصال کنندوں اور تملیکی مقاصد رکھنے والے کثیر التعداد گروہوں کا تختہ الٹ دیتے ہیں۔ اس جماعت کی صفات میں سب سے پہلی صفت تقویٰ کی ہوتی ہے یعنی اس کے ارکان قانون مکافات عمل کے نتائج سے ڈرتے رہتے ہیں کیوں کہ وہ جبلۃً محسوس کر لیتے ہیں کہ ظلم و استحصال، تکبر اور کمزوروں کے حقوق کی پامالی غرض کہ ساری اجتماعی بداعمالیاں اپنے نتائج پیدا کر کے رہتی ہیں اور غیر محسوس طور پر اس گروہ کی بربادی کے اسباب جمع کرتی ہیں جو ان کا مرتکب ہوتا ہے۔ اسی لیے یہ قلیل التعدد جماعتیں ظلم و تعدی، استکبار اور کمزوروں کے ساتھ ناانصافی کرنے سے بچتی رہتی ہیں اور عدل و خیر کے تخلیقی تقاضے پورے کرتی ہیں پھر دوسری صفت اس گروہ کی یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے نصب العین کی راہ میں ہر قسم کی تکالیف اور مصائب کو نہایت صبر و استقامت سے برداشت کرتا ہے۔ تیسری صفت اس جماعت کی یہ ہوتی ہے کہ وہ جو کچھ کہتی ہے اسے سچ کر دکھاتی ہے۔ اس کے برخلاف تملیکی مقاصد رکھنے والے گروہ اعلانات تو بڑے خوش نما کرتے ہیں، ان کے نعرے بھی بڑے امید افزا اور خوش آئند ہوتے ہیں لیکن جب ان اعلانات، نعروں اور وعدوں کو عملی جامہ پہنانے کا وقت آتا

ہے تو یہ لوگ بری طرح ناکام رہتے ہیں۔ کیوں کہ ان میں صدق کی صفت معدوم ہوتی ہے۔
پھر قرآن اُن گروہوں اور جماعتوں کی جو تخلیقی مقاصد کی جدوجہد کرتے ہیں ایک اور خصوصیت بیان کرتا ہے اور وہ یہ کہ اپنی معاشی تنگ حالی اور بے زری کے باوجود یہ لوگ اپنے مقصد کے لیے نہایت فیاضی اور دریا دلی سے روپیہ خرچ کرتے ہیں۔ ان میں انفاق یعنی اعلیٰ مقاصد کے لیے مالی قربانیاں کرنے کا بے پناہ جذبہ ہوتا ہے جبکہ ان کی مقابل جماعت یعنی تملکی جذبات رکھنے والے گروہ دنیوی دولت اور مادی وسائل کے اعتبار سے تو بہت آگے ہوتے ہیں لیکن چونکہ وہ اسباب زینت اور سامان عیش پر جان دیتے ہیں اور اپنے اعلیٰ معیار زندگی کی بدولت اجتماعی مقاصد کے لیے روپیہ پیسہ خرچ کرنے سے مجبور ہوتے ہیں اس لیے ان میں اپنے مقصد کے لیے مالی قربانیاں کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی جو ایک صالح، ترقی پذیر مگر دنیوی حیثیت سے کم مایہ جماعت کے ارکان میں ہوتی ہے۔ اس طرح قرآن دنیا کی ساری خرابیوں اور تاریخ کی تمام خونریزیوں کی ذمہ داری انسان کی تملکی ذہنیت کے سر رکھتا ہے جو اسے شہوت رانی، لذت طلبی، عیش پرستی، حصول دولت او زینت و تفاخر کے اسباب جمع کرنے میں مشغول رکھتی ہے اور اس میں سے یہ حوصلہ فنا کر دیتی ہے کہ وہ دوسروں کی بھلائی اور ترقی کے لیے بھی اپنا وقت، مال اور اپنی توانائیوں کا کچھ حصہ صرف کرے۔
قرآن کہتا ہے کہ یہ طرز زندگی جس میں جذبہ خدمت اور جذبہ تخلیق کے بجائے جذبہ تفاخر اور جذبہ نمائش غالب ہو بالآخر قوموں اور گروہوں کو بربادی کی طرف لے جاتا ہے۔ اس لیے بہتر طریق زندگی وہ ہے جس میں آدمی ادنیٰ مادی مقاصد یعنی متاع دنیوی کے حصول کی جدوجہد میں عمر نہ ضائع کرے بلکہ اعلیٰ روحانی اور تخلیقی مقاصد کے لیے اپنے آپ کو وقف کردے۔ قوم کا خزانہ خالی کرنے کے بجائے اس میں اپنی طرف سے کچھ ملائے اور اپنے بھائیوں کو گرا کر آگے بڑھنے کے بجائے انھیں بلند کرنے کی امنگ سے سرشار ہو بالفاظ دیگر اکتساب مال و دولت اور حصول اقتدار کی خواہش کے بجائے خدمت اور تخلیق کے جذبہ سے معمور ہو۔

قوانین تاریخ کا قرآنی نظریہ

انسان کی اجتماعی فطرت کی ان بنیادی خصوصیات سے قرآن چند قوانین تاریخ اخذ کرتا ہے جنھیں وہ سنن الٰہی سے موسوم کرتا ہے۔ اور پھر گزری ہوئی قوموں کی زندگی پر ان قوانین یا سنن تاریخ کا اطلاق کر کے وہ اپنی ہمعصر قوموں اور بالخصوص اہل عرب کو جو اس کے مخاطب خاص ہیں، متنبہ کرتا ہے کہ اگر انھوں نے اس طریق فکر اور طرز زندگی کو ترک نہ کیا جن سے پہلی قومیں برباد ہو چکی ہیں تو انھیں یاد رکھنا چاہیے کہ قوانین تاریخ کا عمل ہر قوم کے لیے یکساں ہوتا ہے اور ان کے اعمال کا انجام بھی وہی ہو گا جس کا دوسری قوموں کو تجربہ ہو چکا ہے۔ یعنی قانون مکافات عمل کی گرفت سے ان کا شیرازۂ حیات درہم برہم ہو جائے گا اور وہ اجتماعی حیثیت سے ذلیل، پست اور فنا پذیر ہو جائیں گی۔ چنانچہ تاریخ کے ان ہی غیر متغیر قوانین کا ذکر کرتے ہوئے جن کے عمل سے ہر زمانہ میں تعمیری اور تخریبی انقلابات واقع ہوتے ہیں قرآن کہتا ہے:

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ وَ اِنْ يَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِيْنَ (۳۸:۸)

جن لوگوں نے کفر کیا ہے ان سے کہہ دو کہ اگر تم اپنے اعمال کو ترک کر دو تو جو کچھ پہلے کر چکے ہو سب معاف کر دیا جائے گا لیکن اگر تم کفر پر اڑے رہے تو تم سے پہلوں کی سنت گزر چکی ہے۔

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰى وَيَسْتَغْفِرُوْا رَبَّهُمْ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ (۵۵:۱۸)

جب ہدایت آ گئی تو اب پھر لوگوں کو کس چیز نے روکا تھا کہ وہ ایمان لاتے، اپنے رب سے استغفار کرتے بجز اس کے کہ ان کے ساتھ اگلوں کا طریقہ برتا جائے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ شِيَعِ الْاَوَّلِيْنَ ٥ وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ٥ كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ ٥ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَقَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ (۱۵:۱۰۔۱۳)

اور تجھ سے پہلے بھی لوگوں کے گروہوں میں رسول بھیجے گئے اور ایسا کوئی رسول ان کے پاس نہیں آیا جس کا انھوں نے مذاق نہ اڑایا ہو، اسی طرح ہم اسے مجرموں کے قلوب میں داخل کر دیتے ہیں اور وہ اس پر ایمان نہیں لاتے اور پہلوں کا طریقہ بھی یہی رہا ہے۔

وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَاِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا ٥ سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا (۱۷:۷۶۔۷۷)

اور انہوں نے ارادہ کیا تھا کہ تجھے اس سرزمین میں خلیفہ بنا دیں گے تا کہ تجھے اس سے نکال دیں اور اس صورت میں یہ بھی تیرے پیچھے نہ رہیں گے۔ یہی طریقہ ان پیغمبروں کے ساتھ بھی برتا گیا جو تجھ سے پہلے بھیجے گئے تھے اور ہماری سنت میں کبھی تبدیلی نہ ہوگی۔

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ كَانُوْآ اَكْثَرَ مِنْهُمْ وَاَشَدَّ قُوَّةً وَّاٰثَارًا فِي الْاَرْضِ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ٥ فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ٥ فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْآ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ ٥ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ (۴۰:۸۲۔۸۵)

کیا تم نے زمین میں سیر و سیاحت نہیں کی جو دیکھتے کہ ان لوگوں کا کیا حشر ہوا جو پہلے گزر چکے ہیں اور وہ لوگ ان سے تعداد میں زیادہ تھے اور قوت اور نشانیوں میں بھی جو زمین پر چھوڑ گئے بڑھے ہوئے تھے، تو ان چیزوں نے انھیں کوئی فائدہ نہیں پہنچایا جو وہ کیا کرتے تھے پھر جب ان کے

رسول کھلی ہوئی نشانیاں لے کر ان کے پاس آئے تو وہ اس علم پر خوش ہو گئے جو پہلے ان کے پاس موجود تھا اور ان کو سزا نے آلیا جس پر وہ استہزا کرتے تھے تو جب انھوں نے ہمارا عذاب دیکھا اور ایمان لانے پر آمادہ ہوئے تو ان کے ایمان نے انھیں کوئی نفع نہیں پہنچایا۔ یہی اللہ کی وہ سنت ہے جو اس کے بندوں کی زندگی میں جاری رہتی ہے۔ اور کافروں کو بالآخر نقصان اٹھانا پڑے گا۔

ان آیات میں قرآن نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مطلع کیا ہے کہ تمھارے ساتھ اور تمھاری اصلاحی جماعت کے ساتھ جو معاملہ ہو رہا ہے اور جن تلخ اور ناخوش گوار تجربات سے تمھیں گزرنا پڑ رہا ہے ان پر تعجب یا افسوس کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ یہ محض اتفاقی حوادث نہیں بلکہ یہ سارے واقعات ایک مستقل قانون کے ماتحت ظاہر ہو رہے ہیں۔ اسی قسم کے واقعات پہلے زمانہ میں اصلاحی جماعتوں کو پیش آ چکے ہیں اور آئندہ بھی جو جماعت کسی اصلاحی انقلاب کے لیے کھڑی ہوگی اس کو بھی یہی واقعات پیش آئیں گے۔ کیوں کہ سنن الٰہی یا قوانین تاریخ کا عمل اسی طرح ہوتا رہا ہے اور آئندہ بھی ہوگا۔ انسان کی اجتماعی فطرت کی جو خصوصیات ہم نے بیان کی ہیں ان کا لازمی اقتضا بھی یہی ہے کہ اس قسم کے واقعات پیش آئیں۔

اس طرح قرآن نے سب سے پہلے تاریخ میں مستقل قوانین (سنن الٰہی) کا اثبات کیا اور اس خیال کی تردید کی کہ تاریخ کے واقعات محض بخت و اتفاق یا کسی اندھی بہری مشیت کے تحت عمل میں آتے ہیں۔ قرآن عالم فطرت اور عالم تاریخ دونوں کو مستقل قوانین کا تابع قرار دیتا ہے۔ جس چیز کو ہم مشیت الٰہی قرار دیتے ہیں وہ درحقیقت قوانین فطرت اور قوانین تاریخ عالم ہے کیونکہ مشیت الٰہی انھیں واقعات و تغیرات کے ذریعے اپنا اظہار کرتی ہے جو عالم فطرت اور عالم تاریخ میں رونما ہوتے ہیں۔ جو قومیں ان واقعات کو محض اللہ کی رضامندی اور غیظ و غضب یا تاریخی حوادث پر محمول کرتی ہیں وہ مشیت الٰہی کے فہم سے ہمیشہ عاری رہتی ہیں اور ایسی قوموں کو اپنی کم فہمی کی سزا بھگتنی پڑتی ہے۔ کامیابی انھیں اقوام اور جماعتوں کے حصہ میں آتی ہے جو تاریخ اور فطرت کے واقعات و تغیرات کے مشاہدہ سے ان مستقل قوانین تک رسائی حاصل کر لیتی ہیں جن کی بنا

پر یہ انقلابات سرزد ہوتے ہیں۔ چنانچہ قرآن کا یہ دعویٰ کہ جو یہاں اندھے ہیں وہ آخرت میں بھی اندھے رہیں گے۔ وَمَنْ كَانَ فِي هٰذِهٖ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى (۷۲:۱۷) اسی حقیقت کا اظہار واثبات ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ فطرت کے واقعات سے وہی قوم اور جماعت سبق لے سکتی ہے جو تاریخ وفطرت کے مستقل قوانین کا علم رکھتی ہو یعنی جو واقعات عالم پر ان کی انفرادی حیثیت میں غور نہ کرے بلکہ یہ معلوم کرے کہ یہ واقعات کس مستقل قانون کے ماتحت پیش آ رہے ہیں۔ جو قوم واقعات تاریخ اور حوادث فطرت کے قوانین معلوم کر لیتی ہے وہ اپنی اجتماعی اور تمدنی زندگی میں ضروری اصلاحات بآسانی عمل میں لا سکتی ہے اس کے برخلاف جس جماعت کو یہ بھی خبر نہ ہو کہ اسے جن تجربات وو اقعات سے سابقہ پڑ رہا ہے ان کی اصلی علت کیا ہے جو انقلابات زمانہ اور تغیرات فطرت کو محض اتفاقی حوادث یا کسی نامعلوم مشیت کا نتیجہ سمجھتی ہو اور ان قوانین کے علم سے بے بہرہ ہو جن کے مطابق واقعات عالم صورت پذیر ہوتے ہیں وہ ابدالآباد تک اپنی اصلاح سے عاجز رہتی ہے اور اس کے لیے معاشرت کی رسوم، تمدن کے اوضاع واطوار یا مذہب کے ذیلی اور فروعی عقائد میں اقتضائے حالات کے مطابق تبدیلی پیدا کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس کی معاشرت، اس کا تمدن اور اس کے عقاید مذہبی طرح طرح کی خرابیوں اور نقائص سے لبریز ہوں گے اور اس احساس کے باوجود کہ اس کے اندر کوئی خرابی موجود ہے ان نقائص کے سبب حقیقی سے ناواقف رہیں گی۔ کیوں کہ وہ قوانین فطرت اور قوانین تاریخ یعنی سنن الٰہی کی طرف سے اندھی بہری ہے۔ پھر جو قوم ایسی خرابیوں اور ایسے مفاسد کا شکار ہو، اس کی آخرت بھی یقیناً خراب ہو گی۔ خواہ ہم آخرت سے ان کا دنیوی انجام مراد لیں یا حیات بعد الممات، جو قومیں ظلم واستبداد، معاشی ناانصافیوں، جہالت، عیش وعشرت اور اسی قسم کی دوسری برائیوں میں مبتلا رہتی ہیں ان کے افراد نیک کردار نہیں ہو سکتے۔ اس لیے لازماً ان افراد کی حیات اخروی بھی فلاح وسعادت سے خالی ہو گی۔ لہٰذا قرآن کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ جو جماعت یہاں اندھی ہے وہ وہاں بھی اندھی رہے گی،

یعنی جس گروہ کو قوانین فطرت اور قوانین تاریخ میں درک وبصیرت نہ ہو اس کا انجام اس عالم میں بھی اچھا نہ ہوگا اور عالم آخرت میں بھی اس کی نجات کا کوئی امکان نہیں۔

اس سلسلہ میں ایک غلط خیال ہمارے ذہنوں میں یہ پیدا ہو گیا ہے کہ قرآن اقوام سابقہ کی تباہی اور بربادی کے سلسلہ میں جن قوانین تاریخ یا سنن الٰہی کا ذکر کرتا ہے وہ انھیں قوموں کے تاریخی انجام کو سمجھنے میں مدد دے سکتے ہیں جن کا اس نے بطور خاص تذکرہ کیا ہے اور قرآن کی ہمعصر تاریخ یا زمانہ مابعد کی تاریخ میں جو واقعات وانقلابات پیش آئے ان پر قرآن کے بتائے ہوئے قوانین تاریخ یا سنن الٰہی کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ گزشتہ اقوام کی بربادی جن حالات کے تحت عمل میں آئی وہ موجودہ واقعات و انقلابات کی علتوں سے مختلف ہیں۔ قرآن کے بیان کردہ سنن الٰہی سے قدیم اقوام کے زوال وبربادی کی توجیہہ تو ہوسکتی ہے لیکن خود مسلمانوں کی تاریخ میں جو واقعات وانقلابات پیش آئے اور موجودہ قوموں کی تاریخ میں جو اتار چڑھاؤ ہو رہا ہے وہ ان قوانین کے عمل سے مستثنیٰ ہیں جنھیں قرآن سنن الٰہی سے موسوم کرتا ہے اور جن کے متعلق اس کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ غیر متبدل اور مستقل قوانین حیات ہیں۔ اس نقطہ نظر سے لازمی طور پر نتیجہ بھی مستنبط ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ کے قوانین تاریخ کچھ اور ہیں۔ جبکہ گزشتہ قوموں کا انحطاط وزوال کسی اور قانون کے بموجب عمل میں آیا تھا۔ اگر تاریخ کے متعلق یہ زاویۂ نگاہ اختیار کیا جائے تو اس میں کوئی تسلسل باقی نہیں رہتا اور قرآن موجودہ تاریخ کی توجیہہ کے لیے نہ صرف ناکافی بلکہ بیکار ہو جاتا ہے۔ حالانکہ قرآن نے گزشتہ اقوام کی بربادی کے سلسلہ میں جن قوانین تاریخ کی طرف اشارہ کیا ہے ان میں ایسی کوئی تخصیص نہیں پائی جاتی جس سے ان کی صداقت کسی خاص دور کے لیے صحیح تسلیم کی جائے اور زمانہ مابعد کی تاریخ کے لیے انھیں بے فائدہ تصور کیا جائے۔ قرآن کے انداز بیان میں عمومیت ہے، سنن الٰہی کا اثبات وہ صرف مشرکین مکہ کے مقابلہ میں نہیں کرتا ہے۔ یعنی یہ نہیں کہتا کہ چونکہ مشرکین مکہ ان برباد شدہ قوموں کے قدم بقدم چل رہے ہیں، اس لیے وہ تباہ وبرباد ہو جائیں گے۔ یہ وعید

صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں کے لیے نہیں بلکہ ہر اس قوم کے لیے ہے خواہ وہ کسی دور کی ہو جو ایک غلط طرز زندگی اور غلط طرز فکر کے ماتحت انجام سے بے خبر ہو کر زندگی گزارے۔ لہٰذا قرآن جن سنن الٰہی کا اثبات کرتا ہے ان میں ایک دائمی صداقت ہے اور ان کا اطلاق موجودہ زمانہ کے انقلابات وحوادث پر بھی اسی طرح کیا جاسکتا ہے جس طرح عاد اور ثمود کے واقعات پر۔ چنانچہ اسی کتاب میں آیندہ چل کر ہم موجودہ زمانہ کی تاریخ سے بحث کر کے قرآن کی بیان کردہ سنتوں یا قوانین تاریخ کا اطلاق یورپ کی جدید اقوام اور قرآن کی ہمعصر رومی قوم پر کریں گے۔ جس سے معلوم ہوگا کہ قرآن جس قانون کو سنت الٰہی سے تعبیر کرتا ہے، وہ تاریخ جدید میں بھی اسی طرح کارفرما اور عمل پیرا ہے جس طرح گزشتہ تاریخ میں۔ علاوہ ازیں یہ حقیقت بھی ناقابل انکار ہے کہ خود مسلمان قوم جس عذاب غلامی اور ذلت میں مبتلا ہوئی وہ بھی انھیں سنن الٰہی کے عمل کا نتیجہ تھا جن کی گرفت سے عاد و ثمود، اہل مدین اور اصحاب ایکہ تباہ و برباد ہوئے۔

افسوس اس بات کا ہے کہ مسلمانوں کے اس غلط تاریخی نقطہ نظر سے قرآن کریم کی افادیت کو شدید نقصان پہنچا اور اسے ایک مجموعہ احکام وضوابط یا مجموعہ روایات وقصص تصور کیا جانے لگا۔ حالانکہ قرآن جس طرح معاشرتی اور تمدنی زندگی کے دائرہ میں ہماری ہدایت ورہنمائی کرتا ہے اسی طرح موجودہ واقعات تاریخ اور انقلاب اقوام کی توجیہہ وتشریح کا بھی ایک مخصوص طریقہ بتاتا ہے۔ البتہ چونکہ قرآن کو انسان کے جزوی تمدنی مسائل سے بحث نہیں بلکہ اس کی توجہ تمام تر اجتماع انسانی کے کلی اصولوں پر مرکوز رہتی ہے اس لیے وہ تاریخ کے جزویات سے بحث نہیں کرتا بلکہ تاریخی واقعات وانقلابات کے بنیادی اسباب اور عمومی کلیات کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ قرآن حکیم ہمارے سامنے ایک جامع فلسفہ تاریخ پیش کر کے ہم سے مطالبہ کرتا ہے کہ ہم اپنی ہمعصر زندگی اور اپنے قومی مستقبل پر رائے زنی اور پیش قیاسی کرنے، نیز گردوپیش کی اقوام کے حالات کو سمجھنے میں اس کے فلسفہ تاریخ وتمدن سے مدد لیتے رہیں۔

آیات تاریخ اور آیات فطرت

سنن الٰہی کی اصطلاح کے علاوہ جسے قرآن کریم نے قوانین تاریخ کے لیے استعمال کیا ہے وہ واقعات تاریخ سے استنباط نتائج کے لیے ایک اور اصطلاح یعنی آیت یا آیات کا کثرت سے استعمال کرتا ہے۔ یہ لفظ قرآن نے تین مختلف معنوں میں استعمال کیا ہے، کہیں تو وہ لفظ آیت کو الہامی کتابوں کی عبارت کے لیے استعمال کرتا ہے، بعض جگہ یہ لفظ مشاہدۂ فطرت کے سلسلہ میں استعمال ہوا ہے اور ان معنوں میں قرآن نے قوانین قدرت کے افعال و اثرات کو آیات الٰہی سے تعبیر کیا ہے۔ اس کے علاوہ چند مقامات پر وہ اس لفظ سے واقعات تاریخ کے فہم کی ضرورت کا اثبات کرتا ہے اور ان قوانین کی طرف توجہ دلاتا ہے جو انقلابات تاریخ کی تہ میں کارفرما ہیں۔ اس طرح قرآن میں لفظ آیت اپنے عام مفہوم کے علاوہ اس خاص مفہوم میں بھی مستعمل ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے نزدیک ہدایت کے تین بڑے سرچشمے ہیں۔ یعنی اولاً آیات الٰہی جو پیغمبروں پر نازل ہوئیں، دوسرے آیات فطرت جس طرح وہ عالم طبعی اور عالم فطرت میں ظاہر ہوتی ہیں اور تیسرے آیات تاریخ جن کا مشاہدہ واقعات تاریخ میں ہوتا ہے۔ یہ تین ۲ ذرائع ہدایت یعنی انبیا کی آسمانی کتب، صحیفہ فطرت اور اوراق تاریخ انسان کی مدنی اور اجتماعی ترقی کے لیے ضروری ہیں۔ مسلمانوں نے اپنی الہامی کتاب کو بجا طور سے ہدایت کا سرچشمہ خیال کیا لیکن فطرت اور تاریخ کی راہ سے اللہ تعالیٰ انسانوں کی جو

ہدایت و رہنمائی کرتا ہے اس سے غافل رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اقوام مسلمانوں سے آگے بڑھ گئیں جن کے پاس الہامی کتاب تو نہ تھی لیکن جنھوں نے آیات فطرت اور آیات تاریخ کے فہم و مشاہدہ کی صلاحیت پیدا کر لی۔ قرآن کے نزدیک یہ تینوں اقسام ہدایت ضروری ہیں، چنانچہ جب وہ کہتا ہے کہ کتنی ہی آیات ہیں جو زمین و آسمان میں ظاہر ہوتی رہتی ہیں مگر لوگ ان پر عالم غفلت میں گزر جاتے ہیں وَ كَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ (۱۲:۱۰۵) اور جن حقائق کی وہ خبر دیتی ہیں، ان سے نابلد رہتے ہیں تو قرآن کے اس بیان سے یہ ظاہر ہے کہ وہ الہامی کتابوں میں درج کی ہوئی آیات کا ذکر نہیں کر رہا بلکہ ان آیات کا جو فطرت اور تاریخ میں ظاہر ہوتی ہیں۔ اسی طرح حسب ذیل آیات میں بھی قرآن فطرت اور تاریخ کے واقعات کی طرف توجہ دلانے کے لیے اس لفظ کو استعمال کرتا ہے:

وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ اَحْيَيْنٰهَا وَ اَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ يَاْكُلُوْنَ (۳۶:۳۳)

اور ان کے لیے ایک آیت (فطرت) ہے مردہ زمین کہ ہم نے اسے زندہ کیا اور اس میں سے اناج نکالا تو وہ اس سے کھاتے ہیں اور ایک آیت (فطرت) ہے ان کے لیے یہ کہ ہم ان کی نسل کو بھری ہوئی کشتی میں اٹھاتے ہیں۔

وَاٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ (۳۶:۴۱)

وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الَّيْلُ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ (۳۶:۳۷)

اور ایک آیت (فطرت) ہے ان کے لیے رات جس میں سے ہم دن کو کھینچ لیتے ہیں۔

وَجَعَلْنَا الَّيْلَ وَالنَّهَارَ اٰيَتَيْنِ فَمَحَوْنَآ اٰيَةَ الَّيْلِ وَ جَعَلْنَآ اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ (۱۷:۱۲)

اور ہم نے رات اور دن کو دو آیات (فطرت) قرار دیا پھر رات کی آیت (فطرت) کو مٹا دیا اور دن کی آیت (فطرت) کو روشن بنا دیا تا کہ تم اپنے رب کا فضل (روزی) تلاش کرو۔

لَقَدْ كَانَ فِيْ يُوْسُفَ وَاِخْوَتِهٖ اٰيٰتٌ لِّلسَّآئِلِيْنَ (۱۲:۷)

یوسفؑ اور اس کے بھائیوں کے واقعہ میں جستجو کرنے والوں کے لیے آیات (تاریخ) ہیں۔

اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا (۱۸:۹)

کیا تم نے یہ سمجھا ہے کہ اصحاب کہف اور رقیم ہماری کوئی حیرت انگیز آیات (تاریخ) ہیں۔

وَاِذَا رَاٰكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا اَهٰذَا الَّذِيْ يَذْكُرُ اٰلِهَتَكُمْ وَهُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝ خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ سَاُورِيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْنِ (۲۱:۳۶۔۳۷)

اور جب کافر تجھے دیکھتے ہیں تو وہ تیرا مذاق اڑاتے ہیں۔ کہتے ہیں کیا یہی وہ ہے جو تمھارے معبودوں کا ذکر کرتا ہے اور وہ خود رحمٰن کے ذکر سے انکار کرتے ہیں۔ انسان کو فطرتاً جلد باز پیدا کیا گیا ہے میں تمھیں اپنی آیات (تاریخ) دکھاؤں گا۔ جلدی نہ کرو۔

مولانا محمد علی اپنی تفسیر قرآن میں اس آیت کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ عذاب جس کے متعلق وہ (کافر) سوال کرتے ہیں اسی دنیا کا عذاب ہے کیوں کہ اس چیز کا آلینا جس کی وہ ہنسی کرتے ہیں درحقیقت ان کی اپنی ہلاکت ہے نہ کچھ اور درحقیقت: سَاُورِيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْنِ (۲۱:۳۷) سے صاف ظاہر ہے۔ کیوں کہ وہ جس نشان کو جلدی مانگتے ہیں وہ نشان ہلاکت ہے نہ قیامت اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسے ہی نشان دکھانے کا وعدہ ہے، قیامت نشانی نہیں کہلائی جا سکتی۔

غرض کہ مندرجہ بالا آیات اور بالخصوص آخری آیت کی تفسیر سے جو ایک مشہور مفسرِ قرآن کا نتیجہ فکر ہے یہ ظاہر ہے کہ قرآن آیت کا لفظ ایسے واقعات فطرت اور واقعات تاریخ دونوں کے لیے استعمال کرتا ہے جن سے سنن الٰہی یا تاریخ اور فطرت کے مستقل قوانین پر روشنی پڑتی ہے چنانچہ جب وہ کفار کو مخاطب کر کے فرماتا ہے کہ جلد ہی تم کو خدا اپنی آیت یعنی تمھاری ہلاکت دکھائے گا تو اس سے ظاہر ہے کہ لفظ آیت

ایسے واقعات تاریخ کے لیے استعمال ہوا ہے خواہ وہ پیش آ چکے ہوں یا پیش آنے والے ہوں جن سے انسان اپنے طرز فکر اور طریق حیات کے صحیح یا غلط ہونے کے متعلق کوئی نتیجہ مستنبط کر سکے۔ درحقیقت قرآن آیات فطرت اور آیات تاریخ کی طرف بار بار اشارہ کر کے گمراہ قوموں کو یہ بتانا چاہتا ہے کہ فطرت اور تاریخ کے واقعات میں جو تسلسل، یکسانیت اور باہمی ربط ہمیں نظر آتا ہے وہ اس امر کی قوی دلیل ہے کہ یہ واقعات کسی بنیادی قانون کے مطابق واقع ہوتے ہیں جو تبدیلی اور تغیر سے مبّرا ہے۔ انسان کو یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ مظاہر فطرت یا واقعات تاریخ کسی اتفاقی حادثہ یا نامعلوم مشیت کا نتیجہ ہیں بلکہ اگر وہ غور کرے تو معلوم ہوگا کہ تاریخ اور فطرت دونوں ایک ابدی قانون کے زیر فرمان اور محکوم و تابع ہیں۔ اگر اس قانون کو انسان دریافت کرے جو ان حوادث فطرت اور انقلابات تاریخ میں کارفرما ہے اور پھر اس کی روشنی میں اپنے طرز فکر، طرز حیات اور عملی روش کو بدل دے تو وہ طبعی فطرت اور اجتماعی فطرت اور دونوں سے مطابقت پیدا کر سکتا ہے اور اپنی دنیوی زندگی میں کامیاب و بامراد ہو سکتا ہے۔ قرآن کے نزدیک جو قومیں آیات فطرت اور آیات تاریخ کے مشاہدہ سے اس بنیادی قانون کا علم حاصل نہیں کرتیں جو فطرت اور تاریخ کے اندر جاری و ساری ہے وہ اپنی عملی زندگی میں ناکام، تمدنی حیثیت سے پست اور سیاسی اعتبار سے محکوم و مغلوب رہتی ہیں کیوں کہ وہ اپنی زندگی میں ضروری اصلاحات و تغیرات نہیں کر سکتیں۔ اسی حقیقت کو قرآن یوں بھی بیان کرتا ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوْا بِالْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَ اطْمَاَنُّوْا بِھَا وَالَّذِیْنَ ھُمْ عَنْ اٰیٰتِنَا غٰفِلُوْنَ (۱۰:۷)

کافر وہ ہیں جو ہماری ملاقات کی امید و آرزو سے خالی اور دنیا کی زندگی سے راضی اور خوش ہیں اور جو ہماری آیات (فطرت اور تاریخ) سے غافل ہیں۔

اس آیت میں قرآن منجملہ اور علامات کفر کے ایک علامت کفر یہ بھی قرار دیتا

ہے کہ آدمی آیاتِ فطرت اور آیاتِ تاریخ یعنی حوادثِ طبعی اور انقلابِ تاریخ کی کنہ و حقیقت سے بے خبر رہے اور ان کے بنیادی اسباب پر غور نہ کرنے کی وجہ سے ان سے سبق نہ لے سکے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کافر کائنات پر کسی ایک قانون کی فرمانروائی تسلیم نہیں کرتے بلکہ ہر واقعہ کو ایک جداگانہ علت کا اور ہر حادثہ یا انقلاب کو کسی جزئی مشیت کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ واقعاتِ فطرت اور انقلاباتِ تاریخ میں جو عمومی مشیت اور عالمگیر قانون کارفرما ہے اس تک ان کی نظر نہیں پہنچتی، اسی وجہ سے وہ کثرت پرستی اور شرک میں مبتلا رہتے ہیں۔ اگر وہ ہر واقعہ کو جزئی حیثیت سے دیکھنے کے بجائے اسے ایک سلسلہ کی کڑی سمجھیں اور واقعات کے باہمی روابط پر غور کر کے ان کا عمومی قانون دریافت کر لیں، تو وہ خود بخود کثرت پرستی اور شرک سے باز آ کر توحید یعنی ایک قانونِ واحد کی عالمگیر فرمانروائی کے قائل ہو جائیں جس سے جملہ واقعاتِ عالم اپنی انفرادی صورت میں سرزد ہوتے ہیں۔ قرآن نے جو الزام کافروں پر لگایا تھا افسوس کہ اب مسلمان خود اس کے موردِ مستحق ہو گئے ہیں کیوں کہ عقیدہ توحید دراصل وحدتِ قوانین کے تصور کا نام ہے اور خدا کے واحد ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس کے تمام قوانین جو عالم میں سرگرم کار ہیں ایک واحد قانون کے مختلف اجزا اور فروع ہیں جس سے یہ نتیجہ لازمی طور پر مستنبط ہوتا ہے کہ جملہ واقعاتِ عالم باہم ایک دوسرے سے علت و معلول کے رشتہ میں مربوط اور ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں اور ان کا صدور ایک واحد اور آئین پسند مشیت کے تحت ہوتا ہے۔ اب مسلمانوں کا طرزِ فکر یہ ہے کہ وہ ہر واقعہ کو خدا کی جزئی مصلحتوں اور مختلف مشیتوں کا نتیجہ قرار دیتے ہیں، جس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ عالم میں جتنے واقعات ہیں اتنی ہی خدا کا مشیتیں ہیں اور ہر واقعہ کی ایک جداگانہ اور منفرد علت ہوتی ہے۔ اس طرح توحید کے مدعی ہونے کے باوجود مسلمان ایک نئی قسم کی کثرت پرستی اور جدید طرز کے شرک میں مبتلا ہیں۔ تعددِ الٰہ کے بجائے وہ تعددِ قوانین اور لاتعداد مشیتوں کے قائل ہیں جن کا ایک

دوسرے سے کوئی ربط و تعلق نہیں ہے۔ کافر اقوام کی طرح ہماری موجودہ مسلمان قوم بھی اس واحد مشیت اور عمومی قانون کے فہم وادراک سے عاجز ہوگئی ہے جس سے تمام واقعات فطرت اور انقلابات تاریخ صادر اور وقوع پذیر ہوتے ہیں۔

قرآن اور عمل تاریخ

گزشتہ صفحات میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرآن عمل تاریخ کو قانون مکافات عمل یا قانون جزا و سزا کا نتیجہ قرار دیتا ہے یعنی اس کا دعویٰ ہے کہ قوموں کے اجتماعی اعمال خواہ اچھے ہوں یا برے ایک مقرر وقت پر اپنے نتائج ضرور پیدا کرتے ہیں۔ چنانچہ جہاں کہیں قرآن پرانی قوموں کی تباہی کا ذکر کرتا ہے وہاں وہ اس امر کی تصریح کر دیتا ہے کہ ان قوموں پر جو تباہی نازل ہوئی وہ ان کے اپنے اعمال کے سبب سے ہوئی۔ خدا کو ان سے کوئی ذاتی پرخاش نہ تھی۔ اگر یہ قومیں محض وجود الٰہی کا اقرار کر لیتیں، اور اس کے قانون مشیت یا قانون حیات کی اسی طرح خلاف ورزی کرتی رہتیں تب بھی ان کے ساتھ یہی معاملہ پیش آتا۔ کیوں کہ ان قوموں کا اپنے پیغمبروں سے اصل جھگڑا یہ نہ تھا کہ اس کائنات کا کوئی بنانے والا ہے یا نہیں بلکہ وہ اس حقیقت کے منکر تھے کہ کائنات اور بالخصوص حیات انسانی کا کوئی مخصوص قانون ہے جس سے عملی زندگی میں مطابقت پیدا کرنی ضروری ہے۔ کفار کو خدا کے وجود یا اس کے ایک ہونے سے اتنا شدید انکار نہیں تھا جتنا اس ضابطہ حیات اور طرز فکر سے جو ذات الٰہی کے تصور اور قانون مکافات عمل یعنی جزا و سزا کے عقیدہ سے منطقی طور پر مستنبط ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کو ماننے والی قوموں پر بھی اسی قسم کے عذاب آئے جو پرانی قوموں پر نازل ہو چکے تھے۔ جب انھوں نے خدا کو ماننے کا مطلب صرف یہ سمجھا کہ اس کے وجود یا اس کے ایک ہونے کا اقرار کرنا کافی ہے اور ان کا ذہن اس احساس و شعور سے خالی ہو گیا کہ مشیت الٰہی کے عمومی قانون اور اس سے پیدا ہونے والے ضابطہ حیات سے مطابقت بھی ضروری ہے۔ اقوام مابعد مثلاً عیسائیوں اور مسلمانوں نے ان عذابوں کو

جن میں وہ مبتلا کیے گئے تھے، عذاب نہیں سمجھا حالانکہ انھیں بھی اپنے اعمال کی پاداش اسی طرح ملی جس طرح عاد و ثمود اور دیگر معتوب قوموں کو۔ یہ صحیح ہے کہ قدیم اقوام کو فطری حوادث کی شکل میں سزا دی گئی، کسی قوم پر بادوباراں کا طوفان آیا، کوئی زلزلوں سے تباہ ہوگئی، کسی پر پتھروں کی موسلا دھار بارش ہوئی لیکن اول تو قرآن نے قدیم قوموں میں سے صرف چند اقوام کا ذکر کیا ہے اس لیے بہت ممکن ہے کہ بقیہ اقوام کی تباہی فوجی شکست یا اندرونی بغاوت کے سبب سے عمل میں آئی ہو، دوسرے اقوام قدیم اعجوبہ پرست تھیں اور کسی بات پر اس وقت تک یقین نہیں کرتی تھیں جب تک اس میں کوئی غیر معمولی اور مافوق الفطرت خصوصیت نہ ہو کیوں کہ وہ قانون الٰہی کے فطری آثار و مظاہر اور اس کی عام اور مانوس شکلوں کو ذات الٰہی کی طرف منسوب کرنا الوہیت کی توہین سمجھتی تھیں۔ اس لیے ان کی ذہنی سطح کے مطابق فطرت اور فاطر فطرت نے ان کے لیے عذاب کا وہی طریقہ اختیار کیا جو ان کی سمجھ میں آ سکتا تھا۔ اگر اس کے بجائے انھیں کسی اور طریقہ سے عذاب دیا جاتا، تو وہ اسے خدا کا عذاب ہی نہ تصور کرتیں۔ لیکن جب انسانی فہم وشعور کا ارتقا ایک خاص نوبت پر پہنچ گیا، اور انسانوں میں زیادہ تر قرآن ہی کی تعلیم کے باعث یہ احساس پیدا ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کی کارسازی اور تصرف مافوق الفطرت واقعات وحوادث میں نہیں، بلکہ زندگی کے عام اور فطری واقعات میں موجود اور کارفرما ہے۔ اور تاریخ کے عام واقعات وانقلابات سے بھی مشیت الٰہی کا ظہور ہوسکتا ہے تو قدرت نے عذاب اور پاداش عمل کا وہ طریقہ بھی بدل دیا، جو پہلی قوموں کے ساتھ خصوصیت سے برتا گیا تھا۔ اب کسی قوم پر آگ اور پتھروں کی بارش سے عذاب نہیں آتا اور نہ کوئی قوم پوری کی پوری زلزلوں اور سیلاب کی تباہ کاریوں کی نذر ہو جاتی ہے۔ قدرت کا قانون مکافات عمل اور تاریخ کا انتقام اب خون ریز جنگوں، لڑائیوں، اندرونی فسادات اور داخلی انتشار و برہمی، فوجی بغاوتوں، اقتصادی بحران اور معاشی کساد بازاری کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ عوام الناس ان تباہیوں اور نقصانات کو عذاب الٰہی تصور نہ کریں۔ لیکن اصل حقیقت تو یہی ہے کہ یہ تمام ہنگامے

،فسادات اور انقلابات ہمارے اپنے اعمال سے پیدا ہوتے ہیں۔ گویا تاریخ میں مکافات عمل اور جزا و سزا کا جو قانون کام کر رہا ہے، یہ سب اسی کے مظاہر و نتائج ہیں۔ چنانچہ قرآن نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ عذاب الٰہی کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں اور قدرت کسی ایک ذریعہ سے انسان کو سزا دینے پر مجبور نہیں ہے:

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلَىٰ أَنْ يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ أَوْ مِنْ تَحْتِ أَرْجُلِكُمْ أَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَيُذِيقَ بَعْضَكُمْ بَأْسَ بَعْضٍ (٦:٦٥)

کہو کہ اللہ تعالیٰ اس پر قدرت رکھتا ہے کہ وہ عذاب کو اوپر سے بھیجے، یا نیچے سے لائے، یا تمھیں مختلف برسرِ پیکار گروہوں اور فرقوں میں بانٹ دے اور اس طرح تم میں سے بعض کو بعض کی دشمنی اور سختی کا مزہ چکھائے۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر قانون مکافات عمل یعنی جزا و سزا کا قانون واقعات تاریخ میں جاری و ساری ہے تو کیا اس کا فعل و اثر بالکل اسی طور پر ہوتا ہے جیسا کہ طبعی فطرت میں قانون علت و معلول کا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ مادی اشیا پر وہی اثرات و کیفیات طاری ہوتی ہیں، جن کی سابقہ علتیں مقتضی ہوں اور نتائج ناگزیر طور پر ویسے ہی ہوتے ہیں جیسے اسباب نیز جو علتیں کسی مادی وجود پر عمل کرتی ہیں ان کے اثر کو وہ وجود از خود زائل نہیں کرسکتا جب تک کہ خارج سے کوئی اور بیرونی علت مداخلت کر کے اس کے اثر کو تبدیل نہ کر دے۔ تو کیا اسی طرح جو قومیں اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے ایک مدت تک اسباب ہلاکت جمع کرتی رہی ہیں، وہ کسی نوبت پر اپنی روش اور طرز عمل کو بدل کر ان سابقہ علتوں کے اثرات کو زائل کرسکتی ہیں جو ان کی سابقہ بداعمالیوں کے باعث جمع ہوتے رہتے ہیں۔ بالفاظ دیگر قرآن کا دعویٰ ہے اگر قوموں اور جماعتوں کے حالات مادی اشیا کی حالتوں کے برعکس قانون علت و معلول کی مجبورانہ پیداوار نہیں۔ یعنی قوموں کی تقدیر ان کے اپنے ہاتھ میں ہے نہ کہ خارجی اسباب و حالات کے۔ چاہیں تو اس تقدیر کو وہ اپنے عمل سے بدل دیں اور اپنی شقاوت و نامرادی کا دور ختم کر کے اصلاح اعمال کے ذریعے فلاح و کامرانی اور عزت کی زندگی کا ایک

نیا دور شروع کریں۔ چنانچہ وہ کہتا ہے:

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (۱۳:۱۱)

اللہ تعالیٰ کسی قوم کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ اس کے افراد اپنے آپ کو نہ بدلیں۔

اس آیت سے یہ صاف ظاہر ہے کہ مادی اشیاء کے بالکل برعکس جن کی حالت بدلنے کے لیے کسی خارجی علت کی مداخلت ضروری ہوتی ہے انسانی معاشرہ کی اجتماعی تبدیلیاں بیرونی اسباب یعنی خداوند تعالیٰ کی براہ راست مداخلت کے ذریعے عمل میں نہیں آتیں۔ انسان کی حیات معاشری میں اگر کوئی تبدیلی واقع ہو سکتی ہے، تو داخلی علتوں کے ذریعہ سے یعنی نفس اجتماعی میں پہلے خود احساس تبدیلی پیدا ہونا چاہیے اور پھر اس احساس کی بنا پر مناسب کوششیں عمل میں آنی چاہئیں۔ اگر قوم اپنی حالت سے غیر مطمئن نہ ہو اور تغیر حال کا تقاضا خود اس کے اندر سے نہ ابھرے تو اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے اس کی اصلاح نہیں کرتا، البتہ اگر لوگوں میں یہ احساس و شعور عام طور سے پیدا ہو جائے کہ ہماری ہیئت اجتماعی اصلاح طلب ہے اور ہمیں اپنی ذاتی جدوجہد سے اس حالت کو بدلنا چاہیے تو اللہ تعالیٰ اس جدوجہد میں ان کی امداد و معاونت کرتا ہے اور ان کی کامیابی کے لیے سازگار حالات پیدا کر دیتا ہے۔ اس طرح قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ قومیں اصلاح اعمال کے ذریعے اپنے اندر تغیر پیدا کر سکتی ہیں۔ یعنی قوم کی تقدیر اس کے اپنے ہاتھ میں ہے اور سابقہ حالات و اسباب سے وہ بے بس اور مجبور نہیں ہے کہ اگر سابق میں اس کا نشو و ارتقا غلط اصولوں پر ہوتا رہا ہے، تو آئندہ بھی وہ انھیں خطوط پر چلتی رہے بلکہ وہ اپنے طرز عمل اور طرز فکر کو بدل کر اور سابقہ حالات و روایات اور تعلیمات کے اثرات کو زائل کر کے ایک نئے دور حیات کا آغاز کر سکتی ہے۔ البتہ یہ عمل اس کے اپنے ارادہ سے ظہور پذیر ہوگا، خداوند تعالیٰ خارج سے اس کی تقدیر نہیں بدلے گا اور نہ بالراست اس کے معاملات میں مداخلت کرے گا۔ غرض کہ قرآن اس تقدیر پرستی کے علانیہ خلاف ہے جس کا دعویٰ یہ ہے کہ قومیں اپنی روایات و حالات یا اپنی سابقہ تاریخ کے اثرات و نتائج سے مجبور و بے بس اور اصلاح اعمال یا تغیر احوال کے

ذریعے اپنی قسمت بدلنے سے عاجز ہیں۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ قرآن جغرافی اور معاشی قوانین کو اتنا حتمی نہیں خیال کرتا ہے، جتنا آج کل کا علم جدید۔ موجودہ طرز فکر کی رو سے معاشی حالات اور جغرافی اثرات، قوموں کی زندگی، خیالات، طرز فکر اور عادات و اطوار پر غالب رہتے ہیں اور ان کے خطوط ارتقا کو آخری اور قطعی طور پر متعین کر دیتے ہیں۔ جدید نظریات کے مطابق کوئی قوم اپنے جغرافی ماحول، معاشی حالات اور تاریخی اثرات کے نتائج سے فرار نہیں کر سکتی اور نہ اپنی آزاد مرضی سے کوئی دوسرا طرز فکر، طریق زندگی یا تمدن و معاشرت کا کوئی دوسرا ڈھنگ اختیار کر سکتی ہے۔ بجز اس طرز فکر، طریق حیات اور وضع معاشرت کے جو اس کے معاشی، جغرافی اور تمدنی حالات کے قدرتی تقاضا سے وجود میں آئے۔ اس کے برعکس قرآن کہتا ہے کہ قومیں اپنے حالات کی تبدیلی پر قادر ہیں۔ چاہیں تو غلط راہوں سے مڑ کر سیدھی راہ پر آ جائیں، غلط طریقوں کو ترک کر کے صحیح طرز زندگی اختیار کر لیں، باطل افکار و تخیلات اور گمراہ کن عقاید کا جوا اتار کر حق و صداقت پر استوار ہو جائیں۔ غرض کہ مجموعی حیثیت سے وہ اپنی قسمت کی تشکیل اور تقدیر کی صورت گری پر پوری طرح قادر ہیں۔

پھر قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ تاریخ کا یہ عمل کیوں کر واقع ہوتا ہے جس کی مطابق قومیں بڑھتی اور گرتی ہیں، عروج حاصل کرتی اور پھر زوال و نکبت میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ دوسرے الفاظ میں زمین کی وراثت یا قوموں کی لیڈر شپ ایک جماعت سے دوسری جماعت پر اور ایک گروہ انسانی سے دوسرے گروہ پر کیوں کر منتقل ہوتی ہے۔ کیا یہ محض بخت و اتفاق، جغرافی حوادث اور معاشی حالات کی مساعدت کے باعث ہوتا ہے یا اسی کی تہ میں کوئی اور راز پوشیدہ ہے یعنی اس عمل تغیر اور انقلاب قیادت کا کوئی قانون ہے یا یہ کسی اندھی بہری مشیت اور نامعلوم علت کا نتیجہ ہے۔ قرآن کے نظریہ کی رو سے زندگی اور کائنات کا کوئی شعبہ قانون کی گیرائی سے آزاد نہیں، اس لیے اس عروج و زوال اور رفعت و پستی کا بھی کوئی قانون ہونا چاہیے۔ تو اب سوال یہ ہے کہ وراثت ارضی اور انقلاب امامت کا قانون کیا ہے،

اس کا جواب قرآن کی حسب ذیل آیات میں ملتا ہے:

وَقَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ أَتَذَرُ مُوسَىٰ وَقَوْمَهُ لِيُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَيَذَرَكَ وَآلِهَتَكَ قَالَ سَنُقَتِّلُ أَبْنَاءَهُمْ وَنَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ وَإِنَّا فَوْقَهُمْ قَاهِرُونَ ○ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ اسْتَعِينُوا بِاللَّهِ وَاصْبِرُوا إِنَّ الْأَرْضَ لِلَّهِ يُورِثُهَا مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ ○ قَالُوا أُوذِينَا مِنْ قَبْلِ أَنْ تَأْتِيَنَا وَمِنْ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا قَالَ عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَنْ يُهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ (۷:۱۲۷۔۱۲۹)

موسیٰ کی قوم کے سرداروں نے کہا کیا تم موسیٰ اور اس کی قوم کو مصر سے چلے جانے کی اجازت دے دو گے، تا کہ وہ زمین میں فساد برپا کریں اور تمھیں اور تمھارے معبودوں کو چھوڑ دیں۔ فرعون نے کہا کہ ہم ان کے لڑکوں کو قتل کر دیں گے اور ان کی عورتوں کو زندہ رہنے دیں گے اور یہ امر یقینی ہے کہ ہم ان پر پوری طرح غالب اور مقتدر ہیں۔ موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اللہ سے مدد طلب کرو اور صبر سے کام لو۔ زمین تو دراصل اللہ کی ہے۔ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے وہ وارث ارض بنا دیتا ہے اور کامیابی تو بالآخر قانون جزا و سزا سے خوف کھانے والوں کے لیے ہے۔ انھوں نے کہا ہم کو تیرے آنے سے پہلے اور تیرے آنے کے بعد ایذائیں دی گئیں۔ موسیٰ نے کہا قریب ہے کہ تمہارا رب تمھارے دشمن کو ہلاک کرے اور تمھیں زمین کی خلافت عطا فرمائے تا کہ وہ یہ دیکھے تم کیسا عمل کرتے ہو۔

وَلَقَدْ أَهْلَكْنَا الْقُرُونَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوا وَجَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ وَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِينَ ○ ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ (۱۰:۱۳۔۱۴)

اور ہم نے تم سے پہلے کی قوموں کی ہلاک کر دیا جب انھوں نے ظلم کیا، ان کے رسول ان کے پاس کھلے ہوئے دلائل لے کر آئے لیکن وہ ایمان نہ لائے، اسی طرح ہم مجرموں کو سزا دیتے ہیں۔ پھر ہم نے زمین پر تم کو خلیفہ مقرر کیا تا کہ ہم دیکھیں کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔

وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَکُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَکُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَبْلُوَکُمْ فِیْ مَآ اٰتٰکُمْ اِنَّ رَبَّکَ سَرِیْعُ الْعِقَابِ ۖ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (۶:۱۶۵)

وہی ہے جس نے تمہیں زمین پر خلیفہ مقرر کیا اور تم میں سے بعض کو بعض پر مدارج کی بلندی عطا فرمائی تاکہ جو کچھ تمھیں دیا گیا ہے اس کے بارے میں تمھاری آزمائش کی جائے بیشک تمہارا رب تیزی سے سزا دینے والا ہے اور وہ رحم کرنے والا اور معاف کرنے والا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ لِیَصُدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَسَیُنْفِقُوْنَهَا ثُمَّ تَکُوْنُ عَلَیْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ یُغْلَبُوْنَ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اِلٰی جَهَنَّمَ یُحْشَرُوْنَ ۝ لِیَمِیْزَ اللّٰهُ الْخَبِیْثَ مِنَ الطَّیِّبِ (۸:۳۶۔۳۷)

جو لوگ کفر کرتے ہیں وہ اپنے اموال اللہ کی راہ میں رکاوٹیں ڈالنے کے لیے خرچ کرتے ہیں وہ اسی طرح خرچ کرتے جائیں گے پھر ان کے لیے حسرت ہوگی اور وہ مغلوب ہو جائیں گے اور جن لوگوں نے کفر کیا وہ جہنم میں جمع کیے جائیں گے تاکہ اللہ تعالیٰ خبیث کو طیب سے ممتاز کر دے۔

اَنَّ الْاَرْضَ یَرِثُهَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ ۝ (۲۱ : ۱۰۵)

زمین کی وراثت اللہ کے صالح بندوں کے ہاتھ میں آتی ہے۔

مندرجہ بالا آیات میں سے پہلی آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ ہم زمین کی وراثت یعنی قوموں کی امامت جسے چاہتے ہیں عطا کرتے ہیں، کوئی قوم یہ خیال کرے کہ اسے دنیا کی لیڈر شپ کا اجارہ مل گیا ہے یا وہ وراثت ارضی کی مستقل حق دار ہے تو یہ محض اس کی کور فہمی ہے۔ اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ انجام کار متقی گروہ کے ہاتھ میں ہے یعنی بالآخر وہی قوم غالب رہے گی اور اسی کو امامت عالم کی سرفرازی عطا ہوگی جس میں قانون مکافات عمل اور جزا وسزا کا خوف زیادہ ہو۔ اسی آیت کے آخری حصہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ بھی اعلان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تمھیں (بنی اسرائیل کو) امامت اقوام اس لیے عطا فرمانا

چاہتا ہے تاکہ وہ یہ دیکھ سکے کہ تمہارا عمل کیسا ہوگا۔ دوسری آیت میں بھی یہی بات دہرائی گئی ہے کہ خداوند تعالیٰ قوموں کو مہذب دنیا کی لیڈرشپ اس لیے عطا کرتا ہے تاکہ ان کے اعمال کی آزمائش کرے۔ پھر تیسری آیت میں بھی قرآن اسی دعویٰ کی تکرار کرتا ہے اور اب کی بار مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ سابقہ قوموں کی طرح تمھیں بھی امتحاناً وراثت ارضی یا اقوام عالم کی لیڈرشپ دی گئی ہے۔ یہ نہ سمجھنا کہ تم اس کے مستقل حق دار بن گئے ہو، یا تمھیں امامت عالم کا اجارہ مل گیا ہے۔ چوتھی آیت میں ایک اور بات کہی گئی ہے وہ یہ کہ انقلاب امامت کا یہ تاریخی عمل اس لیے واقع ہوتا ہے تاکہ برے اور اچھے، خبیث اور طیب اور ظالم و عادل میں تمیز ہو جائے۔ پانچویں آیت میں قرآن ایک اور حقیقت پیش کرتا ہے اور وہ یہ کہ زمین کی وراثت اسی قوم کو ملتی ہے، جو صالح ہو یعنی جو جسمانی، ذہنی اور اخلاقی اعتبار سے دوسری اقوام کی بہ نسبت افضل ہو۔ ان سب آیات کو اگر یکجا کر کے تاریخی عمل کے بارے میں قرآن کا نظریہ مستنبط کیا جائے، تو وہ یہ ہوگا کہ اقوام عالم کی امامت اور زمین کی وراثت کسی مخصوص گروہ یا جماعت کا اجارہ نہیں ہے کیوں کہ خدا کو اس عمل سے قوموں کی آزمائش مقصود ہے۔ یعنی خداوند تعالیٰ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ جو مادی، معاشی اور سیاسی وسائل کسی قوم کو اپنی برتری اور غلبہ کی وجہ سے حاصل ہو جاتے ہیں ان کا استعمال وہ کس طرح کرتی ہے۔ علاوہ ازیں اس عمل سے یہ واضح کرنا بھی مقصود ہے کہ کون سی قوم عادل ہے اور کون سی ظالم، کون طیب ہے اور کون خبیث۔ چونکہ قوموں کے اجتماعی کردار اور اوصاف کا اظہار ان کی تاریخ ہی سے ہوتا ہے اور جس طرح وہ دوسری اقوام کے ساتھ معاملہ کرتی ہیں، اس سے ان کی اخلاقی سیرت نمایاں اور واضح ہو کر سامنے آ جاتی ہے۔ اس لیے واقعات تاریخ یا عمل تاریخ ہی وہ آخری کسوٹی ہے جس پر اجتماعی نیکی اور بدی اور اجتماعی فضائل یا رذائل پرکھے جا سکتے ہیں۔ جس قوم کو وراثت ارضی کی نعمت عطا کی جاتی ہے وہ اپنے صالح، عادل اور اہل ہونے کا ثبوت ان واقعات تاریخ میں پیش کرتی ہے جو اس کی توسیع اور فتوحات کے

دوران میں پیش آتے ہیں۔ تاریخی عمل اور واقعات تاریخ کے ٹھوس شواہد سے دنیا پر یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ فاتح قوم مجموعی حیثیت سے زیادہ طاقت ور، زیادہ عادل اور بہتر صفات ذہنی و اخلاقی کی مالک تھی، اور مغلوب قوم کی شکست خود ہی اس کی داخلی کمزوریوں کا پردہ فاش کر دیتی ہے۔ اس لیے قرآن کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ عمل تاریخ کے ذریعے خداوند تعالیٰ خبیث اور طیب کے درمیان امتیاز قائم کر دیتا ہے۔ اسی وجہ سے کوئی مغلوب و مفتوح قوم یہ دعویٰ نہیں کر سکتی کہ وہ اپنی پستی اور زبوں حالی یا اپنی محکومی اور محرومی کے باوجود محض اپنے زبانی عقیدہ یا کتابی اصولوں کے باعث فاتح اور غالب قوم سے علم، اخلاق یا عقل کے اعتبار سے افضل ہے۔ اس طرح قوموں کی اخلاقی فضیلت یا پستی اور صلاحیت کار خود تاریخ کے عمل سے واضح ہو جاتی ہے۔ یعنی تاریخ کے انقلابات و تغیرات قانون انتخاب طبیعی کا ایک وسیلہ ہیں جس کے ذریعے فطرت ہر شعبہ زندگی اور ہر سطح حیات میں ادنیٰ اور اعلیٰ کو ایک دوسرے سے چھانٹتی رہتی ہے، اسی انتخاب طبیعی کو قرآن اپنی اصطلاح میں خبیث وطیب کی تمیز سے موسوم کرتا ہے اور انقلاب امامت کی توجیہہ اس طرح سے کرتا ہے کہ فطرت مختلف قوموں کو یکے بعد دیگرے یہ موقع دیتی ہے کہ وہ اپنی اہلیت، صلاحیتِ کار اور فضیلت اخلاق کا ثبوت مہیا کریں، جب تک وہ اپنے عمل سے اس آزمائش میں کامیاب رہتی ہیں اور اپنی کارکردگی اور اخلاقی فضیلت کے معیار کو قائم رکھتی ہیں، ان کے عروج و ترقی کا دور جاری رہتا ہے لیکن جب ان کے اخلاقی اقدار و معیارات گرنے لگتے ہیں، عیش و راحت طلبی کی وجہ سے ان کی کارکردگی خراب ہو جاتی ہے اور زینت و تفاخر کے مرض میں مبتلا ہو کر ان کا مال دار اور با اثر طبقہ اپنے کمزور اور بے سہارا ہم قوموں نیز دوسری محکوم اقوام کے حقوق پامال کرنے لگتا ہے تو ان کا دور اقبال ختم ہو جاتا ہے اور وہ روز بروز زوال کی طرف بڑھنے لگتی ہے۔

غرض کہ قرآن کی وہ تمام آیات جو اوپر درج کی گئی ہیں مسلمانوں کے اس نظریہ کے خلاف ہیں کہ محض کلمہ گوئی یا اسلام کی ظاہری علامات اور رسوم و شعائر کی پابندی ان کی دنیوی

اور دینی نجات کی ضامن ہے یا انھیں تاریخ کے اس انتقام سے بچا سکتی ہے، جو کاہل، عیش پرست اور انفعالی خصوصیات رکھنے والی قوموں کی بربادی کا موجب ہوتا ہے۔ قرآن کے کسی بیان یا اشارہ سے یہ مستنبط نہیں ہوتا کہ اس نے مسلمانوں کو سنت الٰہی یا قوانین تاریخ کے عمل سے مستثنیٰ قرار دیا تھا اور وراثت ارضی کا مستقل حق دار یا امامت عالم کا اجارہ دار بنا دیا تھا۔ قرآن نے صاف الفاظ میں مسلمانوں کو سنا دیا ہے کہ بنی اسرائیل اور دوسری اقوام قدیم کی طرح تمھیں بھی امتحاناً زمین کی بادشاہت عطا کی جا رہی ہے، اگر تم اس بار گراں کے متحمل ہو سکے اور تمھارے اندر وہ خصوصیات باقی رہیں جو ایک غالب اور حکمران گروہ میں پائی جانی چاہییں، تو تمھیں باقی رکھا جائے گا ورنہ تم بھی تاریخ کے انتقام کا شکار ہو جاؤ گے۔ اللہ تعالیٰ نے وراثت ارضی اور تمکن فی الارض کے جو وعدے پیروان اسلام سے کیے تھے، وہ غیر مشروط وعدے نہیں تھے۔ چنانچہ جب قرآن نے یہ اعلان کیا کہ اللہ ایمان والوں اور نیک کردار لوگوں کو زمین کی خلافت عطا کرے گا اور انھیں تمکن فی الارض کی سعادت سے ممتاز فرمائے گا:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ (۲۴:۵۵)

تو اس نے جماعت مومنین کی خصوصیات وصفات بھی بیان کر دی تھیں اور یہ کہہ دیا تھا کہ تم دنیا میں اسی وقت تک سربلند رہو گے جب تک ان صفات کے حامل ہو وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۳:۱۳۹) اب سوال یہ ہے کہ کیا ہم مسلمان مومنوں کی صفات سے متصف ہیں یا ہمارے اندر ان قوموں کی خصوصیات پیدا ہو گئی ہیں جن کی قرآن نے مذمت کی تھی۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو مسلمانوں کی سوسائٹی میں اب وہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں جن پر قرآن نے یہود و نصاریٰ کو مطعون کیا تھا اور جن کی وجہ سے یہ قومیں خلافت ارضی سے محروم کی گئیں، ایسی صورت میں مسلمانوں کا یہ دعویٰ کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ چونکہ وہ کلمہ گو ہیں اور ان میں اسلام کی چند ظاہری علامات اور رسمی عبادات پائی جاتی ہیں، اس لیے تاریخ ان کے ساتھ

وہ انتقامی کارروائی نہیں کرے گی، جو ایک عالمگیر قانون کے تحت وہ دوسری قوموں کے ساتھ کرتی رہی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ہمارا نظام معاشرت، ہماری معاشی زندگی، ہمارے کاروبار اور لین دین کے طریقے اور ہمارے اخلاقی معیارات دنیا کی دوسری قوموں سے مختلف نہیں بلکہ ہماری سوسائٹی میں جتنی عدم مساوات اب پیدا ہوگئی ہے اتنی دنیا کی اور کسی قوم میں مشکل ہی پائی جاتی ہے۔ ہمارے امرا اور خوشحال طبقات اپنے طرز فکر، عادات واطوار اور طریق رہائش میں عام مسلمانوں سے بالکل الگ تھلگ ہیں۔ ہمارے اندر دولت، وجاہت اور عہدہ کی بنا پر جتنے امتیازات پائے جاتے ہیں ان سے دنیا کی ہر ترقی پذیر قوم نا آشنا ہے۔ ہمارے یہاں محض قابلیت، دیانت یا صلاحیت کار کی بنا پر کوئی شخص زندگی کی دوڑ میں آگے نہیں بڑھ سکتا کیوں کہ ہماری سوسائٹی میں مالدار اور بااثر طبقات کے ساتھ عام لوگوں کے مقابلہ میں ترجیحی سلوک کیا جاتا ہے اور متوسط یا غریب افراد کو ترقی کے مواقع سے محروم رکھا جاتا ہے۔ دولت کی پرستش اور عہدہ کی ہوس نے ہمارے لیے ایک معبود کی صورت اختیار کر لی ہے۔ ہم زبان سے خدا کا نام لیتے ہیں اور اس کی عبادت کا دم بھرتے ہیں، لیکن ہماری ساری زندگی اس بات کا ثبوت ہے کہ ہم اپنے جسم و ذہن کی تمام توانائیاں وسائل عیش اور اعزاز دنیوی کے حصول میں صرف کرتے ہیں اور عملاً انھیں مادی اور محسوس معبودوں کی پوجا کرتے ہیں، اس طرح ہم نے اصلی خدا سے منہ پھیر کر اپنے نفس کی باگ جھوٹے خداؤں کے ہاتھ میں دے دی ہے۔ وہ بے باک حق گوئی اور حق شناسی جو مومنین اولین کا نشان امتیاز تھی ہمارے اندر سے بالکل مفقود ہوگئی ہے، کیوں کہ ہم کسی سچائی یا کسی اعلیٰ مقصد کے لیے اپنا ذاتی نقصان کرنا اور اپنے شخصی، خاندانی اور قبیلوی مفاد کو خطرہ میں ڈالنا پسند نہیں کرتے۔ ان حالات میں ہم یہ دعویٰ کیسے کر سکتے ہیں کہ ہمارے اندر اسلام اور ایمان کی وہ صفات موجود ہیں، جو ہمیں تاریخ کے ہاتھوں تباہی سے محفوظ رکھیں گی، اور ہم ان آفات ومصائب سے دور رہیں گے، جن میں غافل، عیش پرست اور دولت پر جان دینے والی قومیں ناگزیر طور پر مبتلا ہو جاتی ہیں۔

درحقیقت ہماری تمام خرابیوں کی اصلی جڑ یہ ہے کہ ہمارے دلوں میں قانون مکافات عمل یعنی

جزاوسزا کا خوف باقی نہیں رہا ہے جسے قرآن تقویٰ سے موسوم کرتا ہے۔ حالانکہ یہی صفت مذہب کی اصلی روح اور دین کی بنیاد واساس ہے۔ ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ جو قومیں تباہی کے قریب آن پہنچتی ہیں، ان میں تقویٰ کی صفت معدوم ہو جاتی ہے، یعنی ان کے خوشحال اور بااثر اشخاص سمجھنے لگتے ہیں کہ سیاسی تدابیر معاشی قوت اور فوجی طاقت کے ذریعے وہ اپنی عیش پرستی ظلم اور ناانصافیوں کے ناگزیر نتائج سے محفوظ رہیں گے۔

تباہ شدنی قوموں اور مائل بہ انحطاط طبقوں میں قانون مکافات عمل کا خوف یعنی تقویٰ کی صفت کیوں باقی نہیں رہتی اور وہ یہ کیوں سمجھنے لگتے ہیں کہ سیاسی حیلہ بازیوں، غلط پروپیگنڈے اور بے معنی مذہبی یا سیاسی نعروں سے وہ اپنے اعمال کی پاداش اور اپنی عیش پرستیوں کے نتائج سے محفوظ رہیں گے، اس کا جواب بھی ہمیں قرآن ہی کے صفحات میں ملتا ہے، چنانچہ وہ کہتا ہے:

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَاَ يْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَ هُمْ نَذِيْرٌ لَّيَكُوْنُنَّ اَهْدٰى مِنْ اِحْدَى الْاُمَمِ فَلَمَّا جَآءَ هُمْ نَذِيْرٌ مَّا زَادَهُمْ اِلَّا نُفُوْرَا o اسْتِكْبَارًا فِى الْاَرْضِ وَمَكْرَ السَّيِّئِ وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِيْنَ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا o اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَكَانُوْآ اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعْجِزَهٗ مِنْ شَيْءٍ فِى السَّمٰوٰتِ وَلَا فِى الْاَرْضِ اِنَّهٗ كَانَ عَلِيْمًا قَدِيْرًا o وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِعِبَادِهٖ بَصِيْرًا (۳۵:۴۲ـ۴۵)

اور وہ بڑے زور کی قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ اگر ان کے پاس ڈرانے والا آ جائے تو وہ قوموں میں سے ہر ایک سے بڑھ کر ہدایت یافتہ ہوں گے پھر جب ڈرانے والا آ گیا تو ہدایت پانے کی جگہ وہ اس سے روز بروز متنفر ہی ہوتے گئے۔ یہ لوگ ہیں جو تکبر کیا کرتے

تھے اور بری تدابیر میں مصروف رہتے تھے حالانکہ بری تدابیر کا وبال صرف ان کے کرنے والے پر پڑتا ہے تو کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے اگلوں کے ساتھ کیا طریقہ برتا اور اللہ کے قوانین میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی ہے اور کیا تم نے زمین کی سیر و سیاحت نہیں کی جو دیکھتے کہ اگلے لوگوں کا کیا انجام ہوا، حالانکہ وہ قوت میں ان سے زیادہ تھے اور اللہ کو زمین و آسمان کی کوئی چیز جزا و سزا کے عمل سے تھکا نہیں سکتی۔ بے شک وہ جاننے والا اور قدرت رکھنے والا ہے اور اگر اللہ لوگوں سے ان کے اعمال کا فوری مواخذہ لے تو زمین پر کوئی جانور بھی باقی نہ رہے لیکن وہ اعمال کی جزا و سزا کو ایک مقرر میعاد تک ملتوی کر دیتا ہے لیکن جب وہ میعاد ختم ہو جاتی (تو ظاہر ہو جاتا ہے) کہ اللہ اپنے بندوں کو خوب دیکھ رہا تھا۔

اس آیت میں قرآن نے زوال آمادہ اور مائل بہ شکست قوموں کی اسی خصوصیت کا ذکر کیا ہے جسے ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، یعنی وہ مکر و فریب یا بری سیاسی تدابیر کے ذریعے قانون مکافات عمل کی گرفت سے بچنا چاہتی ہیں، حالانکہ ایسی باطل اور فریب کارانہ تدابیر، خوشنما اعلانات اور دلفریب نعروں کی زد بالآخر انھی افراد اور طبقات پر پڑتی ہے جو انھیں اپنی حفاظت کے لیے استعمال کرتے ہیں پھر قرآن ان افراد و طبقات کی اس غلط فہمی کو بھی دور کر دیتا ہے کہ وہ اپنی معاشی قوت، سیاسی چالاکی یا فوجی قوت کا استعمال کر کے اپنی بداعمالیوں اور مظالم کے نتائج سے بچ جائیں گے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ تم سے پہلے جن سرکش اور جابر طبقات و اقوام کو ان کے کیے کی سزا ملی ان کی معاشی طاقت، سیاسی عیاری اور فوجی قوت تم سے زیادہ تھی۔ لیکن اس کے باوجود چونکہ قانون مکافات عمل کی گیرائی سے زمین و آسمان کا کوئی گوشہ آزاد نہیں۔ اس لیے ان کی تمام ذہنی، معاشی اور فوجی صلاحیتیں ان کو پاداش عمل سے محفوظ نہ کر سکیں۔ آیات کے آخری حصہ میں اللہ تعالیٰ قانون مکافات عمل کے انداز کار کی وضاحت فرماتے ہوئے کہتا ہے کہ اس قانون کے مواخذہ سے تو کوئی بچ نہیں سکتا لیکن لوگوں کو دھوکا اس لیے ہوتا ہے کہ ان کے اعمال کے نتائج ایک مقررہ وقت سے پہلے ظاہر نہیں ہوتے۔ اگر اللہ تعالیٰ ہر برے عمل کا نتیجہ فوراً سامنے لے آئے تو بہت کم حیوانات اور انسان ہلاکت و تباہی سے بچ

سکیں گے۔ اس لیے قانون الٰہی یہ ہے کہ انسانی بداعمالیوں کے نتائج کسی قدر تاخیر و تعویق کے ساتھ منظر عام پر آتے ہیں اور برے عمل کی سزا فوراً ہی نہیں ملتی کیوں کہ خداوند تعالیٰ انسان کو اصلاح اعمال اور تغیر احوال کا موقع دیتا ہے تاکہ اگر وہ اپنی روش اور طرز عمل میں تبدیلی پیدا کرے تو اعمال بد کے نتائج سے محفوظ رہے۔ لیکن جب قدرت کے اس انتظار و مہلت کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا ہے اور لوگ حسب سابق اپنی بداعمالیوں اور خلاف ورزیوں پر مصر رہتے ہیں تو بالآخر ایک مقرر وقت پر تاریخ اپنا انتقام لینا شروع کر دیتی ہے اور پھر عرصہ دراز کی بداعمالیوں کے نتائج اتنی تیزی سے ظاہر ہونے لگتے ہیں کہ ان کے مرتکبین کو مزید اصلاح و ہدایت کا موقع نہیں ملتا۔ اس طرح ظالم اور عیش پرست طبقات، اقوام کو جو چیز قانون مکافات عمل سے بے خوف بنا دیتی ہے وہ اس قانون کی سست رفتاری ہے۔ اگر ہمارے سیاسی، معاشرتی اور اجتماعی کردار کے نتائج فوراً ظاہر ہو جایا کرتے تو کسی شخص کو یہ دھوکا نہ ہوتا، اور ہر انسان قانون مکافات عمل کے نتائج کو ملحوظ رکھ کر کام کرتا۔ لیکن سیاست و معاشرت اور اجتماع و تمدن کے دائرہ میں ایسا نہیں ہوتا ہے بلکہ صرف جسمانی امور میں قدرت کسی قدر تعجیل سے کام لیتی ہے۔ چنانچہ قوانین جسم کی خلاف ورزی کے نتائج ہر فرد کو اپنی زندگی کے دوران ہی میں بھگتنے پڑتے ہیں۔ مثلاً ہماری غذا اور طرز رہائش اصول صحت کے خلاف ہو تو اس کی پاداش میں ہمیں جسمانی کمزوری یا اور کوئی مرض لاحق ہو جائے گا۔ اگر ہم کھانے پینے میں ضروری احتیاط نہ برتیں تو امراض معدہ میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اس طرح جسمانیات کے دائرہ میں قوانین قدرت کی خلاف ورزی کے نتائج جلد ہی سامنے آ جاتے ہیں اور انسان کو موقع ملتا رہتا ہے کہ وہ اپنا طرز عمل بدل کر اور قوانین صحت کی پابندی کر کے اس سزا سے نجات حاصل کر لے، لیکن معاشرت و تمدن اور قومی زندگی کے دائرہ میں جو روحانی امراض اور اخلاقی عوارض قوانین فطرت کی خلاف ورزی کے باعث پیدا ہو جاتے ہیں، ان کی تشخیص اور ان کا صحیح علاج اتنا آسان نہیں کیوں کہ اس دائرہ میں قانون مکافات عمل بڑی سست رفتاری سے کام کرتا ہے اور انسانی بداعمالیوں کے نتائج عرصہ دراز تک منظر عام پر نہیں

آتے۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ جسمانی صحت وتندرستی اور جسمانی کمزوری کا تعلق فرد کی ذات سے ہے اور افراد کی عمر طبعی قوموں کی مدت حیات کے مقابلہ میں بہت کم ہوتی ہے چونکہ قدرت کو بقائے نوع کے لیے افراد کی بقا مطلوب ہے اور افراد کی عمر طبعی مختصر ہوتی ہے اس لیے جسمانی زندگی کے دائرہ میں قانون مکافات عمل زیادہ تیز رفتاری سے کام کرتا ہے اور اس کے اثرات ونتائج اتنے نمایاں ہوتے ہیں کہ بہت کم لوگ ان کو نظر انداز کر کے اپنی سابقہ روش پر اصرار کرنے کی جرات کر سکتے ہیں کیوں کہ اگر وہ قوانین صحت کی مسلسل خلاف ورزی کرتے رہیں اور اپنے امراض کا علاج نہ کریں تو جسمانی حیثیت سے ناکارہ ہو جائیں یا انھیں اپنی زندگی سے ہی ہاتھ دھونا پڑے۔ اس لیے جسمانیات کے دائرہ میں قانون مکافات عمل کا خوف جسے ہم جسمانی تقویٰ کہہ سکتے ہیں کم وبیش ہر فرد پر طاری رہتا ہے اور اسے قوانین صحت کی خلاف ورزی سے روکتا رہتا ہے یہی وجہ ہے کہ جسمانی امور میں افراد کی بہت بڑی اکثریت قدرت کے قانون مکافات عمل یا قانون جزا وسزا پر جبلتہً ایمان رکھتی ہے چنانچہ جسمانی تندرستی کے اصولوں پر جس آدمی کا ایمان جتنا زیادہ پختہ ہوگا یعنی جس شخص کو جسمانیات میں قدرت کے قانون جزا وسزا پر جتنا زیادہ یقین ہوگا وہ اتنا ہی صحت منداور طاقتور ہوگا۔ یا یوں کہیے کہ جو آدمی جسمانی حیثیت سے جتنا زیادہ متقی ہوگا اسی قدر وہ اپنی صحت اور طاقت کی حفاظت میں کامیاب رہے گا، تمدن ومعاشرت اور اجتماعی زندگی کے دائرہ میں اس کے برعکس قدرت کا معاملہ افراد سے نہیں بلکہ قوموں اور جماعتوں سے ہوتا ہے جن کی عمر افراد کی عمر سے زیادہ طویل ہوتی ہے۔ اس لیے تمدنی امور اور معاشرتی زندگی میں قانون مکافات عمل کی رفتار بھی سست ہوتی ہے اور اجتماعی زندگی کے صحیح اور فطری اصولوں کی خلاف ورزی کے نتائج دیر میں ظاہر ہوتے ہیں، کیوں کہ معاشرتی اعمال کے اثرات ونتائج ہماری ذات تک محدود نہیں رہتے بلکہ ایک وسیع دائرہ میں پھیل کر پوری سوسائٹی کو متاثر کرتے ہیں۔ اکثر اوقات ایک شخص ساری عمر نیکیاں کرنے کے باوجود ان کے ثمرات سے مستفید نہیں ہوتا بلکہ اس کی اولاد ان نیکیوں سے فائدہ اٹھاتی ہے۔ چنانچہ ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ ایک شخص

محنت ومشقت اور ایثار و جفاکشی سے اپنے اوپر تکلیف اٹھا کر روپیہ کماتا اور جمع کرتا ہے لیکن ابھی اس کی مالی حالت پوری طرح درست بھی نہیں ہوتی کہ اس کی موت واقع ہو جاتی ہے اور اس کی اولاد اپنے باپ کے جمع کردہ سرمایہ سے فائدہ اٹھاتی ہے حالانکہ اس کی جدوجہد اور محنت میں اولاد کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ اسی طرح بعض اوقات افراد کے اعمالِ بد کا نقصان خود انھیں نہیں پہنچتا بلکہ آنے والی نسلوں کو ان کا نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً ایک شخص اپنا روپیہ پیسہ فضولیات میں اڑا دیتا ہے یا باپ دادا کی پیدا کی ہوئی جائیداد اور ملکیت کو اپنی عیش پرستی کی نذر کر کے اولاد کو مفلس وقلاش چھوڑ جاتا ہے۔ اس کی آئندہ نسل جو اس کی بداعمالیوں اور عیش پرستیوں میں قطعاً شریک نہ تھی ان کرتوتوں کی وجہ سے بدحال اور مصیبت زدہ رہتی ہے، یہی حال انسان کے جسمانی اعمال کا بھی ہے کہ ان کے نتائج صرف فرد کی ذات تک محدود نہیں رہتے بلکہ آئندہ نسلوں کو بھی متاثر کرتے ہیں۔ جو لوگ اپنی لذت پرستی اور شہوت رانی کے باعث جسمانی اعتبار سے کمزور ہو جاتے ہیں، ان کی کمزوریاں اولاد اور آئندہ نسلوں میں منتقل ہوتی رہتی ہیں اور زندگی کی جدوجہد میں ان کے لیے سنگ راہ ثابت ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس بعض افراد اعتدال اور احتیاط کی زندگی بسر کرنے اور خواہشات نفسانی کا کامیاب مقابلہ کرنے کی وجہ سے زاید جسمانی طاقت حاصل کر لیتے ہیں اور اس کا فائدہ صرف ان کی اپنی ذات کو نہیں پہنچتا بلکہ آئندہ نسلیں بھی اس سے مستفید ہوتی ہیں۔ قومی زندگی اور انسان کی حیات اجتماعی پر بھی یہی اصول صادق آتا ہے، ایک قوم اپنی جدوجہد، ایثار و قربانی اور اجتماعی سرفروشیوں سے محکومی اور غلامی کی لعنت سے آزادی حاصل کرتی ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس آزادی کے ثمرات ونتائج سے وہی نسل مستفید ہو جس نے آزادی کی جدوجہد میں حصہ لیا تھا بلکہ واکثر وبیشتر اس جدوجہد کے فوائد ان افراد اور نسلوں کو حاصل ہوتے ہیں جن کا قومی آزادی کی کشمکش میں کوئی حصہ نہ تھا۔ اس کے برعکس ایک دولت مند اور خوشحال قوم اپنی بداعمالیوں، عیش پرستیوں اور غفلتوں کے نتیجہ میں آزادی اور ترقی کی نعمتوں سے محروم ہو کر کسی فاتح گروہ کی غلامی میں مبتلا ہو جاتی ہے تو اس غلامی کی مصیبتیں ان لوگوں کو برداشت نہیں کرنی

پڑتیں جنھوں نے عیش ولذت کی ہوس میں گرفتار ہو کر اپنے مستقبل سے غفلت برتی تھی۔ بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ عیش پسند اور غافل اسلاف تو آرام وچین کی زندگی بسر کر کے دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں اور اس کا وبال ان کی آئندہ نسل پر پڑتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ قانون مکافات عمل کا طریق کار افراد کے ساتھ اور ہوتا ہے اور قوموں کے ساتھ کچھ اور۔ قومی زندگی کی مدت طویل ہوتی ہے اس لیے قومی اعمال کے نتائج خواہ اچھے ہوں یا برے دیر میں ظاہر ہوتے ہیں اور صرف ان لوگوں کو متاثر نہیں کرتے ہیں جنھوں نے واقعتاً ان کا ارتکاب کیا ہو بلکہ آنے والی نسلیں جو ان اعمال میں شریک نہیں ہوتیں ان کے فوائد اور نقصانات سے متاثر ہوتی ہیں۔

انسان کی شخصی زندگی اور قوموں کی اجتماعی زندگی میں قانون مکافات عمل کی کارکردگی کے فرق کی ایک مثال یہ ہو سکتی ہے کہ جب ہم ایک چھوٹے سے تنگ نالے میں اینٹ یا پتھر پھینکتے ہیں تو اس میں فوراً بڑی بڑی لہریں اٹھنے لگتی ہیں جو ہمیں صاف نظر آتی ہیں اور جن کے بارے میں ہماری نگاہ دھوکا نہیں کھا سکتی۔ اس کے برعکس اگر ہم ایک بڑے دریا میں پتھر پھینک دیں تو اس کا اثر اتنا نمایاں نہیں ہوگا بلکہ ہلکی ہلکی لہریں دکھائی دیں گی اور بہت ممکن ہے کہ یہ لہریں اتنی ہلکی ہوں کہ ہمیں نظر ہی نہ آئیں۔ اور ہم اس دھوکہ میں رہیں کہ شاید ہمارے پتھر پھینکنے کا دریا پر کوئی اثر نہیں ہوا حالانکہ پتھر تو پتھر اگر ہم ایک کنکری بھی سطح آب پر پھینک دیں تو وہ بھی اپنا اثر اور نتیجہ ضرور پیدا کرے گی۔ اسی طرح چونکہ فرد کی زندگی محدود ہوتی ہے اس لیے اس کے جسمانی اعمال کا نتیجہ فوراً ظاہر ہوتا ہے اور وہ اپنی زندگی کے دوران ہی میں اپنے اعمال کی جزا و سزا کا مشاہدہ کر سکتا ہے لیکن قوم کی زندگی فرد کے مقابلہ میں لامحدود ہوتی ہے، اس لیے افراد کے اجتماعی، قومی اور معاشرتی اعمال کے اثرات و نتائج بہت دیر میں ظاہر ہوتے ہیں اور عرصہ تک عام انسان کی نگاہ سے پوشیدہ رہتے ہیں۔ اس لیے غافل اور عیش پرست قومیں یا ظالم طبقات کو یہ دھوکا ہونے لگتا ہے کہ تاریخ میں جزا و سزا کا کوئی قانون موجود اور کارفرما نہیں ہے اور انھیں اپنی بداعمالیوں کی پاداش نہیں ملے گی۔ پھر جب دیدہ وَر اور صاحب بصیرت افراد جو اسرار حیات سے واقف ہوتے ہیں انھیں اس

غفلت پر متنبہ کرتے ہیں اور قانون مکافات عمل کا خوف دلاتے ہیں تو ظالموں اور عیش پرستوں کی طرف سے یہ جواب ملتا ہے کہ وہ متوقع نتائج جن سے تم ہمیں ڈرا رہے ہو آخر کیوں ہمارے سامنے نہیں آتے اسی طرز فکر کا حوالہ دیتے ہوئے قرآن حکیم کہتا ہے:

وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ط وَلَوْلَا اَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَآءَهُمُ الْعَذَابُ ط وَلَيَاْتِيَنَّهُمْ بَغْتَةً وَّ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ٥ (۲۹ : ۵۳)

یہ لوگ عذاب کے بارے میں جلد بازی کرتے ہیں اور اگر ہر نتیجہ کے لیے ایک میعاد مقرر نہ ہوتی تو ان پر عذاب آ چکا ہوتا، انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ عذاب ضرور آئے گا اور اس طرح اچانک آئے گا کہ وہ بے خبر ہوں گے۔

وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ ط وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (۲۲:۴۷)

یہ لوگ تجھ سے عذاب کے لیے جلدی کرتے ہیں، انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی نہیں کرتا البتہ اللہ کا ایک دن تمھارے شمار کے لحاظ سے ہزار سال کے برابر ہوتا ہے۔

وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ ط وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ (۱۳:۶)

یہ لوگ اچھائی سے پہلے تجھ سے برائی کے لیے جلدی کرتے ہیں حالانکہ ان سے پہلے عقوبتیں گزر چکی ہیں اور تیرا رب انسانی بدکرداریوں اور مظالم کے باوجود لوگوں کو معاف کرنے میں بڑا فیاض ہے۔

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ. قُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ رَدِفَ لَكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ تَسْتَعْجِلُوْنَ. وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ (۲۷:۷۱-۷۳)

کہتے ہیں کہ وہ عذاب کہاں ہے جس کا وعدہ تم کرتے ہو، کہو کہ شاید وہ تمھارے پیچھے لگا ہوا ہو۔ جس کے لیے تم جلدی کرتے ہو۔ اور اللہ تعالیٰ انسان پر بڑا فضل کرنے والا ہے لیکن

ان میں سے اکثر شکر نہیں کرتے۔

ان آیات میں قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ غافل اور عیش پرست طبقات قانون مکافات عمل کے نتائج پر یقین نہیں رکھتے۔ کیوں کہ ان کو بظاہر اپنی قوم اور سوسائٹی میں کوئی ایسی کمزوری یا خرابی نظر نہیں آتی، جس سے انھیں شکست و تباہی کا اندیشہ ہو، حالانکہ ان کی بداعمالیاں ان کے لیے اسباب شکست جمع کر رہی ہوتی ہیں۔ البتہ یہ ہلاکت اور تباہی جو قانون مکافات عمل کے ناگزیر نتیجہ کے طور پر ظاہر ہوتی ہے چند مہینوں یا چند برسوں میں ان کو نہیں لے ڈوبتی بلکہ اس کے لیے کچھ عرصہ درکار ہوتا ہے۔ کیوں کہ خدا کے شمار و حساب میں ایک ہزار سال بھی ہمارے ایک برس کی مانند ہیں، اس کے علاوہ افراد کی شخصی زندگی کی طرح قوموں اور طبقوں کی زندگی کا بھی اللہ نے ایک اندازہ مقرر فرما دیا ہے، جب تک وقت مقرر نہیں آتا، اس وقت تک کسی قوم یا طبقہ کی بداعمالیوں کے پورے نتائج منظر عام پر نہیں آتے، جو لوگ ان نتائج کو کامل طور پر رونما نہ ہوتے دیکھ کر یہ سمجھتے ہیں کہ خدا کا قانون عذاب وثواب اور فطرت کا قاعدۂ جزا و سزا معدوم یا معطل ہے وہ سخت دھوکا کھاتے ہیں کیوں کہ جس طرح طبعی اور جسمانی فطرت میں اسباب اور علتوں کے نتائج ہر لمحہ پیدا اور جمع ہوتے رہتے ہیں یہاں تک کہ ایک مقررہ وقت پر ان کا ظہور عمل میں آتا ہے اسی طرح قومی اور اجتماعی زندگی میں بھی افراد اور طبقات کے معاشرتی اعمال اپنے نتائج ضرور پیدا کرتے ہیں اور اگر کوئی قوم یا طبقہ اپنی بداعمالیوں سے اسبابِ ہلاکت جمع کرتا رہا ہے تو اس کی پاداش کا جو مقررہ وقت ہے اور ظہور نتائج کے لیے اللہ تعالیٰ نے جو اندازہ قائم فرما دیا ہے اس کے مطابق وقت موعودہ پر تاریخ اپنا انتقام ضرور لے گی، البتہ چونکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے لیے رحمت و مغفرت کا دروازہ ہر وقت کھلا رکھنا چاہتا ہے اور ظالم و بدکردار طبقات و اقوام کو اصلاح اعمال کی پوری پوری مہلت دنیا چاہتا ہے، اس لیے وہ پاداش عمل میں جلدی نہیں کرتا۔

تاریخ کے اس انتقامی عدل کی آہستہ روی اور قانون مکافات عمل کی سست رفتاری کا ایک سبب اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ افراد کی جسمانی زندگی کی مانند قوموں کی اجتماعی اور اخلاقی

زندگی میں بھی موت و حیات اور تعمیر و تخریب کی لاتعداد قوتیں ایک ہی وقت میں ایک دوسرے کے خلاف کشمکش کرتی رہتی ہیں۔ ہمارے جسم کے اندر زندگی اور ہلاکت کے متصادم میلانات ہر لحہ اور ہر آن ایک دوسرے سے ٹکراتے رہتے ہیں۔ ہم روزانہ ہزاروں بے احتیاطیاں اور قانون صحت کی لاکھوں خلاف ورزیاں کرتے ہیں لیکن ہمیں موت نہیں آتی کیوں کہ زندگی کی قوتیں ہماری مساعدت کرتی ہیں اور موت کی طرف لے جانے والی قوتوں کے عمل کو منسوخ، معطل یا سست رفتار کر دیتی ہیں۔ لیکن جب بڑھاپے میں زندگی کی قوتوں کا نشو ونما کمزور پڑ جاتا ہے تو تخریب و ہلاکت کی قوتیں غالب آ کر ہمیں رفتہ رفتہ کمزور اور ضعیف کر دیتی ہیں یہاں تک کہ جب حیات بخش میلانات بالکل معدوم ہو جاتے ہیں اور فنا و ہلاکت کی قوتیں پوری طرح ہمارے نظام جسمانی پر چھا جاتی ہیں تو ہمارا جسمانی وجود فنا ہو جاتا ہے۔ یہی حال اقوام کا ہے کہ ان کی زندگی میں حیات بخش میلانات بھی ہوتے ہیں اور ہلاکت آفرین رجحانات بھی۔ ابتدا میں صحت افزا اور زندگی بخش میلانات نہایت قوی ہوتے ہیں، یہی زمانہ قوموں کے عروج اور نشو ونما کا ہوتا ہے پھر اسی زمانہ میں توسیع مملکت اور فتوحات ملکی کے باعث دولت اور ثروت اور عیش و نشاط کے وسائل کی فراوانی کا آغاز ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے قوم کے اجتماعی نظام میں ہلاکت آفرین رجحانات داخل ہونے شروع ہو جاتے ہیں لیکن ان کی طاقت ابھی کمزور ہوتی ہے اور ان کے مقابلہ میں صحت افزا میلانات بہت قوی ہوتے ہیں، اس لیے اس زمانہ میں قوموں کے اندر زوال وانحطاط کی کوئی ظاہری علامات نہیں پائی جاتیں حالانکہ ان کے زوال کی ابتدا ہو چکی ہوتی ہے لیکن جس طرح آدمی بوڑھا ہونے کے بعد بھی کافی عرصہ تک گرتا پڑتا زندگی گزارتا رہتا ہے، اسی طرح قوموں کا دور زوال بھی عرصہ تک قائم رہتا ہے یہاں تک کہ بالآخر داخلی انتشار یا بیرونی حملہ سے ان کا اجتماعی شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ مگر یہ یاد رہے کہ کوئی قوم بیرونی حملہ آوروں یا فوجی شکست کے ذریعے تباہ نہیں ہوتی، جب تک کہ پہلے اس کی روح، اس کا ذہن، اس کی داخلی قوتیں اور اندرونی نظام زندگی ضعیف اور زوال آمادہ نہ ہو جائے۔ جب

تک انسان کے جسم میں قوت مدافعت رہتی ہے اس وقت تک بیرونی امراض کا حملہ اس پر کامیاب نہیں ہوتا لیکن جب افراد کی داخلی جسمانی مزاحمت فنا ہو جاتی ہے تو معمولی سے معمولی امراض انھیں موت اور فنا کے دروازہ پر پہنچا دیتے ہیں۔

اسی طرح قوم کی اجتماعی بداعمالیوں کے نتائج کا ظہور بھی حیات بخش میلانات کی موجودگی میں ملتوی ہوتا رہتا ہے۔ جب تک تعمیری قوتیں تخریبی میلانات کے عمل کو منسوخ، معطل یا ملتوی کرتی رہتی ہیں، اس وقت تک اقوام اور جماعتوں کی بدکرداری کے نتائج منظر عام پر نہیں آتے۔ اسی وجہ سے خوشحال اور مالدار طبقات کو یہ دھوکا ہوتا ہے کہ تاریخ اپنے انتقامی کردار سے غافل ہے اور قانون مکافات عمل کا نظریہ ایک خالی خولی ڈھونگ ہے۔ چنانچہ ہمارے مغرب زدہ طبقات کو جب کبھی زنا کاری، شراب خوری، عریانی و رقص و سرود اور عیش و نشاط کی گرم بازاری اور عورتوں مردوں کے آزادانہ اختلاط کے نتائج سے آگاہ کیا جاتا ہے تو وہ انگریزوں اور امریکہ کی مثال پیش کر کے یہ جواب دیتے ہیں کہ ان قوموں میں تو یہ خرابیاں پورے زور و شور سے پھیلی ہوئی ہیں لیکن اس کے باوجود یہ لوگ ہم سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں اور ان کا اجتماعی وجود محفوظ ہے۔ اگر عورتوں مردوں کے آزادانہ میل جول اور رقص و سرود کی گرم بازاری سے قومیں تباہ ہو جایا کرتیں تو انگریز اور امریکن اب تک برباد ہو چکے ہوتے۔ یہ لوگ اسی حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں جس کا تذکرہ ہم اوپر کر چکے ہیں یعنی مغرب اور امریکہ کی زوال پذیر قوموں میں بعض صحت بخش میلانات ابھی تک اتنے قوی ہیں کہ ان کی زنا کاری، رقص و سرود، عیش و نشاط اور شراب خوری کے نتائج پوری طرح سے منظر عام پر نہیں آ سکے ہیں۔ یہ زندگی بخش میلانات اس قسم کی بدکرداریوں کے اثرات کو منسوخ، معطل یا کمزور کر دیتے ہیں۔ اول تو ان قوموں کی مادی اور سائنٹفک برتری ان کے قومی ضعف کی رفتار کو تیز نہیں ہونے دیتی۔ دوسرے ان میں قومیت اور وطنیت کا جذبہ اب بھی اتنا طاقتور ہے اور اس نصب العین سے ابھی تک ان کو اتنی گہری وابستگی ہے کہ ان کے افراد اپنی قوم کی آزادی اور تحفظ کی خاطر جان و مال کی بڑی سے بڑی قربانی کرنے پر آمادہ رہتے

ہیں۔ ان تعمیری صفات کی موجودگی میں ان کے تخریبی اوصاف اپنی طاقت کا پورا پورا مظاہرہ نہیں کر سکتے لیکن یہ بات بالکل یقینی ہے کہ شراب خوری، رقص وسرود، عیش ونشاط اور کثرت فواحش کے جو طبعی اور معاشرتی نتائج ہونے چاہییں وہ برابر پیدا ہو رہے ہیں۔ اگر یہ قومیں ان خرابیوں سے پاک ہوتیں تو بہت عرصہ تک ان کی طاقت اور قوت کو کوئی دھچکا نہ پہنچ سکتا اور وہ ان خطرات وآفات سے مدت دراز تک محفوظ رہتیں جو ان کے سروں پر منڈلا رہے ہیں۔ مگر ساری دنیا جانتی ہے کہ مغربی ممالک بالخصوص اور امریکن قوم بالعموم زوال وانحطاط کے دور سے گزر رہی ہے اور ان کی تہذیب وسیاست چند دن کی مہمان ہے۔ پھر ہماری جیسی قوم جس میں نہ سائنس ہے نہ علم ہے اور نہ ہی جوش قومی، صدیوں سے بادشاہوں، امیروں اور متمول طبقات کی غلامی میں مبتلا رہنے کی وجہ سے آزادی کی روح اور جمہوریت کی روایات سے ناآشنا ہو چکی ہے۔ اگر انھی خرابیوں میں مبتلا ہو جائے جن میں انگریز اور امریکن مبتلا ہیں۔ اگر ہمارے یہاں بھی زنا کاری اور اختلاط مرد وزن، عیش ونشاط اور رقص وسرود کا وہی زور شور ہو جائے جو مغربی اقوام میں ہے تو کیا ہم ایک روز بھی میزان حیات میں اپنا وزن قائم رکھ سکیں گے پھر جو لوگ ہمارے معاشرہ میں ان خرابیوں کو پھیلانا چاہتے ہیں یا ان کے پھیلاؤ کو خوشی خوشی گوارا کر لیتے ہیں کیا وہ ہماری قوم کو زوال اور موت کی دعوت نہیں دے رہے ہیں؟

ایسے ہی لوگوں کو مخاطب کر کے جو قانون مکافات عمل کے نتائج کو ظاہر نہ ہوتے دیکھ کر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ شراب خوری، زنا کاری، عیش پرستانہ عادات کی کثرت یا کمزوروں کے حقوق کی پامالی سے کچھ نہیں ہوتا اور ہمیں تو ان باتوں کے باوجود زوال وبربادی کے آثار کہیں نظر نہیں آتے تو قرآن فرماتا ہے:

وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ إِلَيْهِمْ أَجَلُهُمْ (۱۰:۱۱)

اگر اللہ لوگوں کے ساتھ برائی (نتائج بد کے ظہور) میں اتنی ہی جلد کرے جتنی جلدی بازی وہ اچھے کاموں کا اجر طلب کرنے کے لیے کرتے ہیں تو ان کی مقررہ میعاد فوراً ختم ہو جائے۔

وَرَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوْا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ بَلْ لَّهُمْ

مَّوْعِدٌ لَّنْ يَّجِدُوْا مِنْ دُوْنِهٖ مَوْئِلًا ○ وَتِلْكَ الْقُرٰٓى اَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا (۱۸: ۵۸-۵۹)

اللہ تعالیٰ تو معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے ورنہ اگر وہ برے کاموں پر لوگوں کی گرفت کرے تو ان پر فوراً عذاب بھیج دے جس کے مقابلہ میں وہ کوئی پناہ نہ پائیں گے اور یہ آبادیاں ہیں جن کو ہم نے ہلاک کر دیا، جب انھوں نے ظلم کیا لیکن ہم نے ان کی ہلاکت کا ایک وقت مقرر کر رکھا تھا۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ (۱۶: ۶۱)

اگر اللہ تعالیٰ لوگوں سے ان کے ظلم کا مواخذہ کرنے پر اتر آئے تو زمین پر ایک حیوان بھی باقی نہ رہے لیکن وہ ایک مقررہ وقت تک ظہور نتائج کو ملتوی رکھتا ہے پھر جب وہ وقت آ جاتا ہے تو ایک گھڑی کی بھی دیر سویر نہیں ہوسکتی۔

ان آیات میں قرآن نے قانون مکافات عمل کے طریق کار اور فطرت انسانی کی خصوصیات کے بارے میں بعض لطیف نکات بیان کیے ہیں۔ اول تو وہ کہتا ہے کہ ہر واقعہ اور ہر نتیجہ کے ظہور کا ایک وقت ہوتا ہے اور اس وقت موعودہ سے پہلے نہ تو کوئی واقعہ وقوع پذیر اور نہ کوئی نتیجہ ظہور پذیر ہوسکتا ہے۔ یہ وقت اللہ کے ایک اندازہ پر موقوف و منحصر ہوتا ہے جسے قرآن اپنی اصطلاح میں تقدیر کہتا ہے:

وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا (۲۵: ۲)

ہم نے ہر شے کو بنایا اور پھر اس کے لیے ایک اندازہ مقرر کیا

اسی وقت کو قرآن کہیں اجل کہتا ہے اور کہیں موعد کے نام سے موسوم کرتا ہے، انسانی اعمال کے پورے نتائج کبھی وقت مقررہ سے پہلے نہیں ظاہر ہوتے۔ باقی یہ حقیقت تو موجودہ سائنس کی رو سے بھی ثابت ہے کہ ہر سبب اپنا نتیجہ اور ہر علت اپنا معلول ضرور پیدا کرتی ہے۔ مادہ کی حرکت کے مانند انسان کا ہر فعل یہاں تک کہ اس کا کوئی ذہنی تصور اور خیال بھی بے اثر اور

بے نتیجہ نہیں ہوتا۔ یہ بات کہ وہ نتیجہ فوراً سامنے نہیں آتا اور بظاہر اس کا کوئی خارجی اثر محسوس نہیں ہوتا، انسان کو اس دھوکے میں مبتلا کر دیتی ہے کہ وہ کبھی ظاہر ہی نہ ہوگا۔ حالانکہ اس کا ظہور اتنا ہی یقینی ہے جتنا سورج کا مشرق سے طلوع ہونا لیکن جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں معاشرتی زندگی میں متضاد اسباب و نتائج اور مخالف علتیں ایک دوسرے کے اثر کو منسوخ، معطل یا کمزور کرتی رہتی ہیں۔ اس لیے بعض اسباب کے نتائج روپوش رہتے ہیں اور اس وقت تک ظاہر نہیں ہوتے جب تک کہ ان کے فعل و ظہور کو روکنے والے اسباب درمیان سے نہ ہٹ جائیں۔ قوموں کی حیاتِ اجتماعی دراصل قوتوں کا ایک متوازیہ ہے جس میں ایک قوت دوسری کو دفع کرتی رہتی ہے اور بالآخر اس قوت کا مظاہرہ ہوتا ہے جو مجموعی قوتوں کے ٹکراؤ کے بعد بچ رہتی ہے۔ اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ دوسری قوتیں موجود ہی نہ تھیں یا تھیں تو بے اثر اور بے نتیجہ رہیں تو یہ دعویٰ اس کے قصورِ فہم کی غمازی کرتا ہے۔ قوتیں تو سب موجود تھیں لیکن ان میں سے ہر ایک کا نتیجہ الگ الگ ظاہر نہیں ہوا بلکہ مجموعی نتیجہ منظر عام پر آیا۔ معاشرتی زندگی میں اس مجموعی نتیجہ کے ظاہر ہونے کے لیے کچھ وقفہ درکار ہوتا ہے جس کو قرآن اجل کہتا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ انسان فطرتاً بے صبر واقع ہوا ہے۔ وہ اپنی محنت اور مشقت، اپنی جدوجہد اور اپنے اعمال خیر و شر کے نتائج جلد ظاہر ہوتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہے، حالانکہ حیات اجتماعی افراد کی محدود اور مختصر زندگی پر نہیں، بلکہ کئی نسلوں کی زندگی پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس لیے اس کے دائرہ میں انسانی اعمال اپنا نتیجہ دو ایک روز میں نہیں بلکہ عرصہ دراز کے بعد پیدا کرتے ہیں۔ ایک فرد کی شخصی زندگی ساٹھ ستر سال سے زیادہ کی نہیں ہوتی، پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اتنی قلیل مدت میں ان اعمال کے نتائج کا مشاہدہ کر لے جس میں اس نے اور اس کے اسلاف کی کئی ایک نسلوں نے حصہ لیا ہے۔ اس حقیقت کو نظر انداز کر کے لوگ قرآن کی زبان میں استعجال یعنی جلد بازی کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کے اچھے اور برے کاموں کے نتیجے جلد ان کے سامنے آ جائیں۔ انسان کی اسی بے صبری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن فرماتا ہے:

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ۝ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ۝ وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ۝ اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝ وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ (۷۰:۱۹-۲۷)

انسان کو بے صبرا پیدا کیا گیا ہے، جب اسے کوئی برائی ستاتی ہے تو مضطرب ہو جاتا ہے اور جب اچھا زمانہ آتا ہے نیکی سے رکنے لگتا ہے، بجز ان لوگوں کے جو عبادت پر ہمیشگی اختیار کرتے ہیں، جو اپنے مالوں میں محروموں اور ناداروں کا حق تسلیم کرتے ہیں۔ جو جزا و سزا کے دن کی تصدیق کرتے ہیں اور اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے رہتے ہیں۔

یہاں قرآن نے انسان کی فطری بے صبری اور جلد بازی کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اس کمزوری سے وہی لوگ بری ہو سکتے ہیں جنھیں خدا کے قانون جزا و سزا پر اعتقاد ہو اور جن کو یہ یقین ہو کہ اعمال کے نتائج ضرور بالضرور ظاہر ہو کے رہیں گے۔ جو اشخاص قانون مکافات عمل کی قطعیت کو نہیں مانتے اور کائنات میں جزا و سزا کا جو غیر مختتم مگر غیر مرئی سلسلہ جاری ہے، اس کے احساس و شعور سے خالی ہیں، ان کی حالت یہ ہوتی ہے جیسا کہ قرآن نے بیان کیا ہے کہ نیکی کرتے ہیں اور اس کا کوئی عمدہ نتیجہ فوراً ظاہر نہیں ہوتا یا اس کی وجہ سے کوئی عارضی دشواری اور مصیبت پیش آ جاتی ہے تو فوراً مایوس ہو کر نیک عملی سے باز آ جاتے ہیں کیونکہ نیک اعمال کی جزا اور انعام کا یقین ان کے اندر پختہ نہیں ہوتا۔ اسی طرح جب ان کو دولت و ثروت یا طاقت حاصل ہو جاتی ہے تو انھیں اچھے کاموں سے کوئی رغبت نہیں رہتی۔ بلکہ دوسروں کو بھی وہ نیک عملی سے روکنے لگتے ہیں کیوں کہ قانون مکافات عمل کی قطعیت اور جزا و سزا کی لافانی حقیقت پر ان کا ایمان متزلزل ہوتا ہے۔ وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ چونکہ ان کی بداعمالیوں کے نتائج فی الفور سامنے نہیں آئے، اس لیے یہ نتائج کبھی ظاہر نہ ہوں گے اور کائنات میں مکافات عمل کا کوئی قانون ہی نہیں یا ہے تو سیاسی تدابیر اور حیلہ جوئی یا معاشی اقتدار و قوت کے ذریعے اس کے نتائج سے بچاؤ ہو سکتا ہے۔ اس طرح دولت اور

اقتدار کا غرور انسان کے اعتقادِ جزا و سزا کو کمزور اور متزلزل کر کے اسے اپنے اعمال سے غافل اور احتساب نفس سے بے پروا بنا دیتا ہے۔ اسی بے صبری کی وجہ سے انسان جزا و سزا، انعام و عقوبت اور ثواب و عذاب کو فوراً اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہے اور جب ان کے ظہور میں دیر ہوتی ہے تو نیک کرداری کے اچھے نتائج سے مایوس ہو کر تعمیری اقدار اور تخلیقی مقاصد کی جدوجہد چھوڑ بیٹھتا ہے اور برے کاموں میں جو تملیکی جذبات کے اثر سے وجود میں آتے ہیں مصروف ہو جاتا ہے۔ اس کے برخلاف جو لوگ حقیقت حیات سے باخبر اور قوانین کائنات سے آگاہ ہوتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ نیکی سے فوراً کتنی ہی تکالیف ہوں اور اعمال خیر وقتی حیثیت سے کتنی ہی محرومیوں کے موجب ہوں بالآخر ایک نہ ایک روز اپنا انعام ضرور لائیں گے۔ اسی طرح بدی اور بدعملی کے نتائج خواہ اُن کا ظہور فوراً عمل میں نہ آئے کبھی نہ کبھی ضرور بھگتنے پڑیں گے۔ جس شخص کا ایمان و اعتقاد یہ ہو اور جسے قوانین حیات کی ایسی بصیرت حاصل ہو وہ نیکی اور عمل خیر پر ہر صورت اور ہر حالت میں قائم رہتا ہے، اگرچہ اس کے نتائج ناخوشگوار معلوم ہوں اور بدی اور بدکرداری کے عذاب سے اس وقت بھی ڈرتا رہتا ہے جب کہ بظاہر اس کے ظہور کا کوئی امکان نظر نہ آئے۔ تاریخ کی اصلاحی اور انقلابی جماعتیں اس اعتقاد میں بڑی پختہ ہوتی ہیں کہ اعمال کے فطری نتائج ضرور ظاہر ہوں گے اور اس کے دشمن خواہ کتنے ہی قوی ہوں اپنی بدکرداریوں کے باعث ایک روز ضرور مغلوب و مفتوح ہوں گے۔ اسی عقیدہ کے باعث وہ اپنے طاقتور مخالفین کے تمام مظالم و شدائد کو صبر و تحمل کے ساتھ برداشت کر لیتے ہیں۔ اگر اعمال کی جزا و سزا کا یہ عقیدہ اتنا مضبوط اور استوار نہ ہو تو ان کے لیے انقلابی جدوجہد کی صبر آزما صعوبتوں سے کامیاب نکل آنا ناممکن ہو جائے۔ البتہ یہ اور بات ہے کہ غیر مسلم انقلابی گروہ اس جزا و سزا کو اسی دنیا سے متعلق سمجھتے ہیں جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی انقلابی جماعت یعنی صحابہؓ اس ثواب و عذاب اور انعام و عقوبت کو دنیا اور آخرت دونوں سے متعلق سمجھتے تھے۔

قوانین تاریخ اور عقیدۂ توحید کا باہمی تعلق

قرآن نے بت پرستی اور مشرکانہ رسوم کو اقوام کے زوال وہلاکت کا سب سے بڑا سبب قرار دیا ہے۔ چنانچہ اس نے متعدد مقامات پر بتایا ہے کہ جن قوموں پر عذاب نازل ہوا، ان میں پہلے نبی بھیجے گئے جنھوں نے لوگوں کو توحید کی دعوت دی اور اللہ تعالیٰ کے قانون حیات اور قانون فطرت کے مطابق زندگی بسر کرنے کی ہدایت کی لیکن کفار ومشرکین نے ان نبیوں کا مذاق اڑایا، ان کی تکذیب اور خلاف ورزی میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا اور اپنی بت پرستی پر بدستور قائم رہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بالآخر وہ زوال وانحطاط میں مبتلا ہو کر تاریخ کے اسٹیج سے غائب ہو گئے۔ بظاہر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ شرک وبت پرستی کا قومی انحطاط وزوال سے اور عقیدہ توحید کا جسم قومی کی صحت مندی اور اجتماعی ترقی سے کیا تعلق ہے لیکن ذرا گہری نظر سے دیکھا جائے تو ان کا باہمی تعلق صاف واضح ہو جائے گا۔ شرک وبت پرستی انسان کے اس توہم پرستانہ اعتقاد کا نتیجہ ہے کہ انسانی زندگی کی فلاح وسعادت کا کوئی ضابطہ یا قانون نہیں ہے۔ گویا جس طرح چاہو زندگی بسر کرو، قومی طاقت اور اجتماعی شیرازہ بندی میں کوئی فرق نہیں آئے گا کیوں کہ کائنات اور انسان کی فطرت اجتماعی کسی قانون کی پابندی کا تقاضا نہیں کرتی کہ جس کی خلاف ورزی مہلک نتائج پیدا کرے۔ جن قوموں کا عقیدہ یہ ہو ان میں قانون مکافات عمل کا خوف باقی نہیں رہتا اور وہ اس یقین سے تہی دامن ہو جاتی ہیں کہ تاریخ انسانی بدکرداریوں کو معاف نہیں کرتی بلکہ ان کا شدید ترین انتقام لیتی ہے۔ ایسی قومیں صرف باطل تصورات سے ڈرتی ہیں اور غلط سہاروں پر زندگی بسر کرتی ہیں کہیں کسی ایسی چیز کو قومی زندگی کے لیے خیر وسعادت کا موجب سمجھ لیتی ہیں، جس کا اجتماعی فلاح سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ کہیں ایسی باتوں سے ڈرنے لگتی ہیں، جن کے کرنے نہ کرنے سے کوئی بڑا نتیجہ پیدا نہیں

ہوتا۔ بعض اشیا مقامات یا مواقع کو منحوس اور بعض کو مبارک تصور کر لیا جاتا ہے جبکہ بعض مظاہر فطرت کو مفید اور بعض کو نقصان رساں قرار دیا جاتا ہے۔ اس طرح جن باتوں سے واقعی ڈرنا چاہیے ان سے مشرک قومیں نہیں ڈرتیں بلکہ بیکار اندیشوں اور بے جا خوف و ہراس میں مبتلا ہو کر اپنی تمام قوتیں اور توانائیاں ایسے اعمال اور ایسی کوششوں میں ضائع کر دیتی ہیں، جن سے قوم یا سوسائٹی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ جو چیزیں واقعتاً قومی زندگی کو نقصان پہنچاتی ہیں مثلاً عیش پسندانہ عادات، لذت اور دولت کی غیر معمولی ہوس اور تعمیری کاموں سے عدم دلچسپی ان سے کوئی فرد خوف نہیں کھاتا۔ اسی طرح تاریخ میں مکافات عمل، جزا و سزا اور عذاب و ثواب کا جو غیر محسوس سلسلہ جاری ہے اس کا شعور بھی مضمحل ہو کر فنا ہو جاتا ہے۔ بے اصل باتوں سے خوف کھانا اور اتفاقی حوادث و مظاہر کو اپنی الفتوں اور وابستگیوں کا مرکز بنا لینا، ایسی اقوام کی ایک مشترکہ خصوصیت ہوتی ہے۔ یہ تمام خرابیاں دراصل اس غلط عقیدے سے پیدا ہوتی ہیں کہ انسان کی فطرت اجتماعی کسی مستقل قانون حیات کی مقتضی نہیں، جس سے مطابقت پیدا کرنا اجتماعی فلاح و صلاح کے لیے ضروری ہو اور تاریخ کے واقعات کسی عمومی قانون یا مشیت کے تحت وجود میں نہیں آتے بلکہ ہر واقعہ کی ایک جداگانہ علت ہوتی ہے اور ہر حادثہ کے پس پشت ایک مستقل مشیت کارفرما ہوتی ہے اس طرح شرک و بت پرستی کے باعث قومیں تاریخ اور مشیت الٰہی کے عمومی قانون کا تصور کھو بیٹھتی ہیں۔ صرف ظاہری عبادات، خارجی مراسم اور چند مخصوص قومی شعائر کی پابندی کو بقائے حیات کا وسیلہ سمجھ لیتی ہیں اور زندگی میں جو چیز واقعی کلیدی اور بنیادی اہمیت رکھتی ہے یعنی اچھے اعمال و اخلاق، سیرت کی مضبوطی اور اصول و قوانین کی پابندی ان کی طرف سے ایک عام غفلت برتی جانے لگتی ہے۔ جس کا نتیجہ زوال و ہلاکت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

عقیدہ توحید کا انسان کی حیات قومی اور ہیئت اجتماعی سے جو گہرا تعلق ہے، اسے واضح کرتے ہوئے ایک انگریز مصنف آر۔ ایچ ٹاؤنر (R.H. Towner) اپنی کتاب Philosophy of Civilization میں لکھتا ہے:

''غیر مرئی اور غیر محسوس حقائق کی پرستش کا انسان کے ارتقائے عقلی سے بڑا گہرا رشتہ ہے۔غیب پر ایمان لانا اور ان دیکھی چیزوں پر یقین رکھنا انسان کی روحانی ترقی کا ایک حقیقی پیمانہ ہے۔تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عقلی حیثیت سے وہی قومیں ترقی پذیر رہیں جنھوں نے اپنی روحانی قوت کے ذریعے غیر مرئی حقائق کا ادراک کیا، چنانچہ تاریخ سے حسب ذیل مثالیں پیش کی جاتی ہیں''۔

بنی اسرائیل

ایک ان دیکھے خدا کا یقین بنی اسرائیل کا وہ نمایاں وصف تھا، جو انھیں اپنی ہمسایہ اور ہمعصر قوموں سے ممتاز کرتا تھا۔ بنی اسرائیل کی روحانیت اور مادی ترقی میں عروج و زوال اسی نسبت سے ہوا جس نسبت سے انھوں نے ان دیکھے خدا پر اعتقاد پیدا کیا یا اس اعتقاد سے دستبرداری اختیار کی، جن لوگوں نے سنہرے بچھڑے کی پرستش شروع کر دی تھی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انھیں بنی اسرائیل میں سے خارج قرار دے کر قتل کروا دیا۔اسی واقعہ کے بعد سے بنی اسرائیل کی حیات قومی میں مادی ترقی اور نشو و نما کے آثار نظر آنے لگے۔ ابراہیم علیہ السلام، اسماعیل علیہ السلام، یعقوب علیہ السلام، یوسف علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام، یوشع علیہ السلام، سموئیل علیہ السلام، دانیال علیہ السلام، غرض کہ بنی اسرائیل کے تمام عقلا اور دانشور وہی لوگ تھے جن کا اعتقاد ان دیکھے خدا پر بہت پختہ تھا۔ عام لوگوں کی عقلی پسماندگی نے انھیں کئی مرتبہ شرک و بت پرستی اور توہم پرستی میں مبتلا کیا۔حضرت سلیمان علیہ السلام کی پرشکوہ حکومت کے بعد بنی اسرائیل شہوت پرستی، انسانی قربانیوں اور محسوس و مشہود دیوتاؤں کی پرستش میں گرفتار ہو گئے۔ان کے پیغمبروں نے شخصی حیثیت سے ان دیکھے خدا کا دامن نہیں چھوڑا لیکن بنی اسرائیل کے عام افراد بت پرست ہی رہے۔

یونان

یونانی عقل جتنی زیادہ ترقی یافتہ ہوتی گئی اسی قدر وہ محسوس اور مادی اشیا کے بجائے مجرد تصورات و حقائق کی پرستش کرنے لگی۔ فیثا غورث نے حیات کے بنیادی قانون کا نظریہ پیش کرتے ہوئے بتایا کہ یہ قانون حسیات اور جذبات کی رسائی سے ماورا

ہے، اس کا وجود غیر مرئی اور صرف انھیں افراد کے لیے قابل فہم ہے جو مجرد تصورات قائم کر سکیں۔ سقراط ہمیشہ تجریدی تصورات کی تلاش کرتا اور ذہنی تجریدات کی اہمیت پر زور دیتا رہا۔ لیکن غیر مرئی اشیا پر یونانی ذہن کو جو قدرت حاصل تھی اس کا سب سے بڑا ثبوت خود یونانی زبان ہے، جو تجریدی حقائق کے اظہار کے لیے دوسری تمام زبانوں سے زیادہ موزوں ہے۔

رُوم

بنی اسرائیل کی مانند روما کے باشندوں کو بھی تعلیم دی گئی تھی کہ وہ تصاویر یا بتوں کی پرستش نہ کریں۔ پلوٹارک اپنی مشہور کتاب سوانح میں لکھتا ہے کہ نوما نے رومیوں کو تاکید کی تھی کہ وہ خدا کی ہستی کو جانوروں یا انسانوں کی شکل نہ دیں۔ رومی تاریخ کے ابتدائی ایک سو ستر سال تک کسی تصویر یا مجسمہ کا وجود رومیوں میں نہیں پایا جاتا تھا۔ ان کے مندر بتوں اور مجسموں سے پاک تھے اور ان کا عام اعتقاد یہ تھا کہ خدا کی ہستی کو محسوس اور مرئی صورت دینا اس کے تقدس پر دھبہ لگانے کے مترادف ہے۔ مامسن کی تاریخ سے بھی اس امر کی تصدیق ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ رومیوں کے ابتدائی طریق پرستش میں خدا کی تصویر یا اس کی کسی محسوس اور مرئی شکل کا وجود نہ تھا۔ اسی طرح رومی عبادت کے اغراض کے لیے کوئی علیحدہ مندر یا عبادت گاہ نہیں بناتے تھے۔ بعض لاطینی قبائل نے دیوتاؤں کے جو بت تراشے تھے وہ غالباً یونانیوں کی تقلید تھی اور بعض مقامات پر ان کے چھوٹے چھوٹے مندر بھی تھے۔ لیکن اس قسم کی تصویر آرائی اور بت سازی کو نوما کے قوانین کی خلاف ورزی خیال کیا جاتا تھا اور اس کے متعلق یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہ ایک بدعت ہے جو غیر قوموں سے مستعار لی گئی ہے۔ خود رومی مذہب نے خدا کی کوئی مرئی اور محسوس شکل نہیں قائم کی تھی۔

عیسائی

قدیم ترین عیسائی نسلی اور قومی حیثیت سے یہودی اور حضرت موسیٰ کے قانون کے پیرو تھے۔ جس نے تصویر سازی اور مجسمہ تراشی کو ممنوع قرار دیا تھا۔ حضرت عیسیٰ

نے کبھی کسی مادی یا محسوس شکل کی پرستش نہیں کی ۔ اپنی پوری زندگی میں وہ مجرد حقائق پیش کرتے رہے ۔تصاویر اور مجسموں کے احترام کا چرچا عیسائیوں میں چوتھی صدی کے بعد رائج ہوا۔ اس صدی کے اختتام پر عیسائیوں کی انحطاط پذیر قوم کے لیے ایک غیر مرئی خدا کی پرستش دشوار ہوگئی اور انھیں عبادت کے اغراض کے لیے مادی اور محسوس اشیا کی حاجت ہوئی ۔ چنانچہ ولیوں، مقبروں اور تبرکات کا غیر معمولی احترام اسی زمانہ کی پیداوار تھا۔لیکن عیسائیوں کے بت پرستانہ میلانات اپنی علاقوں میں زیادہ نمایاں تھے جو رومی تہذیب وتمدن کا مرکز بن گئے تھے۔ وحشی جرمن سے اقوام جنھوں نے عیسائی مذہب قبول کیا، بالطبع بت پرستانہ میلانات سے نفرین تھیں ۔اسی طرح مشرق و مغرب کے دور دراز صوبے، جہاں رومی تہذیب کی روشنی بہت کم پھیلی تھی بت پرستی اور مشرکانہ رسوم سے نسبتاً پاک تھے۔

مسلمان

مسلمانوں اور عیسائیوں میں بارہ سو سال تک جو کشمکش جاری رہی اس کی تاریخ بھی یہی ثابت کرتی ہے کہ بت پرستی اور مشرکانہ رسوم قوموں کو فوجی شکست اور اجتماعی انتشار کی طرف لے جاتی ہیں ۔اسلامی تاریخ کی پہلی صدی میں انھیں ہر مقام پر عیسائیوں کے مقابلہ میں فتح حاصل ہوئی ۔ کیوں کہ اس زمانہ کے عیسائی شرک و بت پرستی میں مبتلا تھے اور اس کے بالمقابل مسلمان خالص توحید کے علمبردار تھے جو ابتدا میں شرک کی تمام آمیزشوں سے پاک تھی ۔جب مسلمانوں اور عیسائیوں میں بت پرستی اور شرک کا زور قریب قریب برابر ہوگیا تو مسلمانوں کی فتوحات کا دور ختم ہوگیا۔ اس کے بعد مسلمان اور زیادہ مائل بہ شرک ہوتے گئے ۔ دوسری طرف عیسائیوں نے رفتہ رفتہ بت پرستانہ اور مشرکانہ رسوم سے توبہ کرلی ۔اس وقت سے عیسائی مسلمانوں پر غالب آنے لگے۔ فلسطین کی ارض مقدس جس طرح یکے بعد دیگرے مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان منتقل ہوتی رہی وہ بالکل اسی ریاضیاتی قانون کے مطابق تھی۔

آ گے چل کر یہی مصنف اس امر کی عقلی توجیہہ بھی پیش کرتا ہے کہ شرک و بت پرستی سے قومیں کیوں زوال و بربادی کی طرف مائل ہوتی ہیں، اور توحید خالص ان کے اندر کیوں ترقی پیدا کرتی ہے، چنانچہ وہ لکھتا ہے:

تجریدی تصورات کی پرستش انسانی ذہن کو آزاد کر دیتی ہے۔ جن بچوں کو عبادت کے لیے کسی مرئی اور محسوس شکل کا توسط نہیں ملتا، وہ مجبوراً اپنے معبود کا کوئی خیالی تصور پیدا کرتے ہیں۔ خدا کی ذات وصفات کے بارے میں انھیں جو تعلیم دی جاتی ہے اس سے انھیں اپنے معبود کا تصور آراستہ کرنے میں مدد تو ملتی ہے، لیکن چونکہ یہ صفات عقلی ہوتی ہیں اور کسی محسوس و مجسم صورت میں ان کے سامنے نہیں آتیں اس لیے ہر فرد اور ہر نسل کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنے معبود کا تصور خود قائم کرے کیوں کہ کوئی بنا بنایا مکمل اور محسوس و مشہود معبود اس کے پیش نظر نہیں ہوتا۔ اس تصور کو قائم کرنے اور اس کے خدوخال معین کرنے میں ہر فرد اور ہر نسل کو دماغی کاوش کرنی پڑتی ہے جس کی وجہ سے اس کی عقل ترقی پذیر رہتی ہے، توحید کے پرستاروں کی ہر نسل کا معبود اپنی پیش رو نسل کے معبود سے جدا ہوتا ہے۔ اس طرح عقلی آزادی برقرار رہتی ہے اور انسانی ذہن پابہ زنجیر نہیں ہونے پاتا، جب کبھی عقل وتفکر کا طوفان امنڈتا ہے تو وہ پہلے کے تعمیر کردہ بند کو توڑ کر آگے نکل جاتا ہے۔ بت پرستی اس ارتقائے فکر کا راستہ ہر طرف سے روک دیتی ہے۔ ایک بت جسے روایتی تقدس حاصل ہو گیا ہو، جس کی پرستش زمانہ دراز سے معین ومقرر ہو اور جسے از رُوئے قانون مستند تصور کر لیا گیا ہو، وہ ہر نئی نسل کو ذہنی حیثیت سے ایک خاص سطح پر روک رکھتا ہے اور کسی فرد یا نسل کے لیے یہ غیر ممکن ہوتا ہے کہ وہ ماضی کی روایات اور پرستش کے معینہ طریقوں سے ہٹ کر کوئی نئی راہ اختیار کرے۔ صدیاں گزر جاتی ہیں لیکن اصنام پرست اقوام کے بت بلاترمیم وتبدیلی اپنی جگہ برقرار رہتے ہیں۔ وہ اختلاف وتنوع جو ایک غیر مرئی خدا کے تصور سے پیدا ہوتا ہے بت پرستوں اور مشرکوں کی سوسائٹی میں ناممکن ہے۔ ہر نسل کو یہ سکھانے کے بجائے کہ تم اپنے معبود کا تصور خود آراستہ کرو، اسے صرف یہ اجازت ہوتی ہے کہ وہ اپنی آنکھیں استعمال کر کے اپنے معبود کو اس کے تخت پر بیٹھا ہوا

دیکھ لے جہاں وہ صدیوں سے مسند نشین ہے۔

اس توجیہ وتشریح میں ہم اپنی طرف سے اتنا اضافہ کریں گے کہ خدا پرستی اور توحید اسی صورت میں قومی اور اجتماعی زندگی کے لیے مفید وسودمند ہوسکتی ہے، جب اس کے ساتھ مشیت الٰہی کے قانون کا بھی کوئی تصور موجود ہو۔ جو قومیں صرف خدا کے وجود کو تسلیم کر لیتی ہیں خواہ وہ خدا مرئی ہو یا غیر مرئی، محسوس شکل میں پیش ہو یا غیر محسوس شکل میں لیکن خدا کے تصور سے اس کی مشیت کے عمومی قانون کا جو تصور مستنبط ہوتا ہے اسے تسلیم نہیں کرتیں۔ ان کی خدا پرستی کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ کیوں کہ ایسی قوموں کا خدا بھی ایک بت بن کر رہ جاتا ہے، اگرچہ یہ بت خیالی اور تصوری ہوتا ہے اور اس کی کوئی ظاہری تصویر نہیں بنائی جاتی۔ ایسی قوموں میں تقویٰ کی صفت نہیں پیدا ہوسکتی ہے کیوں کہ تقویٰ تو دراصل قانون مکافات عمل کا خوف ہے، پھر اگر یہ تصور ہی نہ موجود ہو کہ خدا کا کوئی مستقبل قانون حیات یا اس کی کوئی عمومی مشیت بھی ہے، جس کے ساتھ مطابقت پیدا کرنا قومی اور اجتماعی زندگی کی فلاح کے لیے ضروری ہے تو خدا کا وجود ایک شخصی اور انفرادی وجود بن جاتا ہے۔ یوں گویا اس کی محبت بھی ایک معین اور مشخص ہستی کی محبت ہو جاتی ہے نہ کہ اس قانون زندگی، اس تصور حیات اور طرز فکر کی محبت جو خدا کی عمومی مشیت سے وجود میں آتا ہے پھر چونکہ قانون مکافات عمل پر جو مشیت الٰہی کے عمومی قانون کی ایک فرع ہے لوگوں کو اعتقاد نہیں رہتا، اس لیے نہ وہ نیکی کے خوش گوار نتائج کی توقع سے پُرامید ہوسکتے ہیں اور نہ بدی اور بدکرداری کے نتائج سے خوف کھا سکتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ خدا پر ایمان لانا، اس کے قانون جزا وسزا پر ایمان لانا ہے، اگر جزا وسزا کے قانون کا اعتقاد نہ ہو تو خدا کو ماننا اور نہ ماننا یکساں ہے لیکن یہ بھی یاد رہے کہ اس جزا وسزا کا تعلق صرف عالم آخرت سے نہیں ہے بلکہ اسی دنیا میں اعمال کی جزا وسزا انسان کو انفرادی اور قومی حیثیت سے ملتی رہتی ہے۔ اس لیے جو قومیں جزا وسزا اور عذاب وثواب کو صرف آخرت سے متعلق سمجھتی ہیں وہ رہبانیت میں مبتلا ہو کر عذاب الٰہی کی مستحق بن جاتی ہیں۔ خدا کا قانون جزا وسزا تاریخ کے ہر دور میں اپنے نتائج ظاہر کرتا ہے۔ جو

قومیں دنیوی حیثیت سے ترقی کرتی ہیں وہ بھی اسی قانون کے مطابق آگے بڑھتی ہیں جبکہ جو قومیں جہالت، افلاس اور غلامی میں مبتلا ہو کر ذلت و پستی کے قعر میں گرتی ہیں، ان پر بھی یہ دنیوی عذاب اسی قانون کے مطابق نازل ہوتا ہے۔ لہٰذا خدا کا تصور دراصل ایک عمومی اور کلی قانون کا تصور ہے۔ جس کے مطابق اجتماعی فلاح و ترقی اور اجتماعی زوال و شکست کے تاریخی مظاہر رونما ہوتے ہیں۔ اگر انسان کا ذہن اس کلی اور عمومی قانون کے تصور سے خالی ہو تو اس کی خدا پرستی بھی بت پرستی ہے۔

اجتماعی انحطاط کے قرآنی قوانین

زوال پذیر اور شکست آمادہ اقوام کی ایک خصوصیت جس پر قرآن نے بار بار روشنی ڈالی ہے ان کی طبقاتیت ہے۔ یعنی ان کے اندر طبقاتی تفریق اور امیر و غریب کا امتیاز نہایت شدید اور مکروہ صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اور طبقاتی تقسیم اتنی گہری مضبوط اور مستحکم ہو جاتی ہے کہ ایک طبقہ اور دوسرے طبقہ کے خیالات وافکار، معتقدات، طرز رہائش اور طریق زندگی میں کوئی مناسبت یا مشابہت باقی نہیں رہتی، چنانچہ حسب ذیل آیات قرآنی میں زوال پذیر قوموں کی طبقاتیت کا ذکر کیا گیا ہے:

وَقَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِلِقَاءِ الْآخِرَةِ وَأَتْرَفْنَاهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا لا هَٰذَا إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ يَأْكُلُ مِمَّا تَأْكُلُونَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُونَ ۝ وَلَئِنْ أَطَعْتُمْ بَشَرًا مِثْلَكُمْ إِنَّكُمْ إِذًا لَخَاسِرُونَ ۝ أَيَعِدُكُمْ أَنَّكُمْ إِذَا مِتُّمْ وَكُنْتُمْ تُرَابًا وَعِظَامًا أَنَّكُمْ مُخْرَجُونَ ۝ هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوعَدُونَ ۝ إِنْ هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوثِينَ (۲۳:۳۳۔۳۷)

نوح علیہ السلام کے سردار جنھوں نے خدا کا انکار کیا اور آخرت کی تکذیب کی اور جنھیں ہم نے زندگی کا عیش دیا تھا کہنے لگے کہ یہ اس کے سوا کچھ نہیں، کہ تمھارے ہی جیسا ایک انسان ہے جو تم کھاتے ہو وہی کھاتا ہے اور جو تم پیتے ہو وہی پیتا ہے۔ اگر تم نے اپنے ہی جیسے ایک آدمی کی اطاعت کی تو گھاٹے میں رہو گے۔ کیا یہ تم سے وعدہ کرتا ہے کہ جب تم مرنے کے بعد مٹی میں مل جاؤ گے اور تمھاری ہڈیاں تک گل جائیں گی، اس وقت پھر تمھیں زندہ کیا جائے گا۔ کیسی حیرت انگیز بات ہے جس کا یہ ہم سے وعدہ کرتا ہے، زندگی

تو بس یہی زندگی ہے اسی میں مرنا ہے اور جینا ہے اور یہ کبھی نہ ہوگا کہ ہم موت کے بعد پھر اٹھائے جائیں۔

اس آیت میں قرآن نے ہمیں بتایا ہے کہ سچائی کا انکار کرنے والے وہی لوگ تھے جنھیں خدا نے عیش و دولت کے وسائل سے بہرہ مند کیا تھا اور جو اپنی سوسائٹی میں لیڈروں کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس طرح قرآن نے یہاں ایک زوال پذیر طبقہ کا ذکر کیا ہے اور پوری قوم کا ذکر نہیں کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن قومی اور اجتماعی زندگی کی طبقاتی ہیئت (Class Structure) کو بھی تاریخ کا ایک اہم عامل قرار دیتا ہے کیوں کہ اس کی اکثر آیات میں رسولوں سے سرکشی اور قانون الٰہی سے انحرف کے عمل کو قوم کے بڑے بڑے مالدار افراد کی جانب منسوب کیا گیا ہے۔ ذیل کی آیت میں بھی قرآن ایک خاص طبقہ کو انکار و الحاد کے لیے مورد الزام قرار دیتا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ (۳۴: ۳۴)

اور ہم نے کسی آبادی میں کوئی ڈرانے والا نہیں بھیجا۔ بجز اس کے کہ اس آبادی کے خوشحال طبقہ نے علانیہ کہنا شروع کیا کہ جس پیغام کو تم پیش کرتے ہو ہمیں اس کی صداقت سے انکار ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کے واقعہ میں بھی قرآن ان کی قوم کے بڑے بڑے سرداروں کے علاوہ عام لوگوں کا تذکرہ نہیں کرتا، بلکہ اس کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قوم کے مالدار طبقات اپنے غریب ہم قوم افراد کو بڑی حقارت اور ذلت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے:

فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِیْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِیَ الرَّاْیِ (۱۱: ۲۷)

قوم نوح علیہ السلام کے وہ سردار جنھوں نے کفر کی راہ اختیار کی تھی کہنے لگے کہ ہم تو تجھ

میں اپنے ہی جیسے آدمیوں کی صفات دیکھتے ہیں اور تیری بات ماننے والوں میں ہم انھی کی تعداد زیادہ دیکھتے ہیں جن کو ہماری سوسائٹی میں ذلیل اور بیوقوف سمجھا جاتا ہے۔

فرعون اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں بھی قرآن تمام مصریوں کے بجائے فرعون اور اس کے سرداروں کا ذکر کرتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بانی فساد اصل میں یہی طبقہ تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلاف فرعون کی جو کشمکش جاری تھی، اس میں عوام الناس کا کوئی حصہ نہ تھا، چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں:

وَقَالَ مُوسٰى رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَ مَلَاَه‘ زِيْنَةً وَّاَمْوَالاً فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ (۱۰ : ۸۸)

اور موسیٰؑ نے کہا اے رب تو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو دنیوی زندگی کی دولت اور زینت عطا کی ہے تاکہ وہ تیری راہ سے دور ہو جائیں۔

یہ بات کہ قوموں میں گمراہی، ظلم اور کفر و شرک کے بانی مبانی زیادہ اونچے طبقہ کے لوگ ہی ہوتے ہیں، قرآن کی حسب ذیل آیات سے بھی ظاہر ہوتا ہے:

اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَ وُا الْعَذَابَ وَ تَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ۝ وَقَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُ وْا مِنَّا (۲:۱۶۶۔۱۶۷)

جب وہ جنھیں لیڈر بنایا گیا تھا ان سے بیزار ہو جائیں گے جو ان کے پیرو تھے اور عذاب کو دیکھیں گے اور ان کے تعلقات کٹ جائیں گے اور وہ جو پیرو تھے کہیں گے کاش کہ ہمارے لیے دنیا میں پھر واپس جانا ہوتا تو ہم اپنے لیڈروں سے بیزار ہوتے جس طرح وہ آج ہم سے بیزار ہیں۔

وَقَالُوْا رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَ نَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا ۝ رَبَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ (۳۳:۶۷۔۶۸)

اور انھوں نے کہا کہ اے ہمارے رب ہم نے لیڈروں اور بڑوں کی پیروی کی تو انھوں نے ہم کو سچی راہ سے ہٹا دیا۔ اے ہمارے رب تو ان کے عذاب کو دوگنا کر دے۔

ان آیات میں پر مجموعی حیثیت سے غور کیا جائے تو دو چار باتیں صاف نظر آئیں گی، ایک یہ کہ زوال پذیر اور تباہ شدنی اقوام میں طبقاتی تفریق اتنی شدید اور نمایاں صورت اختیار کر لیتی ہے کہ دولت مند اور خوش حال طبقات اپنی ایک الگ اور مستقل قوم بنا لیتے ہیں او رعوام الناس کو نفرت وحقارت کی نگاہ سے دیکھنے لگتے ہیں۔ ویسے طبقات تو ہر زمانہ میں ہوتے ہیں اور اسی طرح دولتمند وغریب کا فرق وامتیاز بھی کسی نہ کسی درجہ میں ضرور موجود رہتا ہے۔ لیکن جب قوم مبتلائے شکست ہونے والی ہوتی ہے تو دولت مند طبقات اور عامۃ الناس کی زندگی میں اتنی وسیع خلیج حائل ہو جاتی ہے کہ قوم کے کرتا دھرتا اور رہنما اکثریت کے خیالات وافکار اور جذبات واحساسات سے بالکل بیگانہ اور نا آشنا ہو جاتے ہیں۔ ان کے مصائب و تکالیف، ان کی حاجات وضروریات اور ان کی شکایات حکمران طبقہ کے کانوں تک پہنچنے ہی نہیں پاتیں یا پہنچتی ہیں تو ہزاروں واسطوں درواسطوں سے اور بالکل غلط اور مسخ شدہ صورت میں۔ جب کسی قوم کے مختلف طبقات میں ایسی وسیع اور نا قابل عبور خلیج حائل ہو جائے کہ عوام کی زندگی اور حکمران طبقہ کا کسی ایک نقطہ پر بھی اتصال نہ ہو سکے اور دونوں اپنی اپنی جگہ ایک علیحدہ اور مستقل قوم بن جائیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ اس قوم کی تباہی کا وقت آن پہنچا ہے۔

سابقہ آیات میں قرآن نے گمراہ وزوال آمادہ طبقات کی ایک اور صفت کا بھی ذکر کیا ہے جسے وہ اتراف کہتا ہے یعنی خوشحالی کا غرور اور دولت کی سرمستی۔ چنانچہ اوپر جن آیات کا حوالہ دیا گیا ہے، ان میں اکثر آیتوں میں زوال پذیر قوموں اور طبقوں کی اس خصوصیت کا ذکر موجود ہے۔ اس کے علاوہ حسب ذیل آیتوں میں بھی قرآن نے اسی صفت کی نشان دہی کی ہے:

وَ اِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا (۱۷:۱۶)

اور جب ہم کسی آبادی کو تباہ کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو ہم اس کے خوش حال طبقات کو حکم دیتے ہیں۔ پھر وہ خوب دل بھر کر فسق وفجور کرتے ہیں تو ان پر ہمارا قول پورا ہو جاتا ہے

اور ہم اس آبادی کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتے ہیں۔

وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا (۲۸:۵۸)

اور کتنی ہی آبادیوں کو ہم نے تباہ کر دیا۔ جنھیں اپنی معیشت پر غرور ہو گیا تھا تو یہ ان کے مسکن ہیں جن میں ان کے بعد بہت کم لوگ رہ گئے۔

فَلَوْ لَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ (۱۱:۱۱۶)

پھر کیوں تم سے پہلے کی آبادیوں میں اچھے عمل والے لوگ نہیں ہوئے جو ملک میں فساد کو روکتے ہاں تھوڑے سے ایسے لوگ رہے جنھیں ہم نے نجات دی اور جو ظالم تھے وہ آسائش اور خوشحالی کے غرور میں بدمست رہے اور یہی لوگ مجرم تھے۔

ان آیات میں قرآن معاشی وسائل کی فراوانی اور اسباب عیش کی کثرت کو عذاب الٰہی کی وجہ اور زوال قومی کا سبب قرار دیتا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی قوم پر زوال و انحطاط کا عمل اسی وقت شروع ہوتا ہے جب وہ معاشی اعتبار سے خوشحالی کے درجہ تک پہنچ چکی ہو اور اس کے افراد میں اپنی مادی ترقی اور معاشی برتری کا غرور پیدا ہو گیا ہو۔ ایسے دور میں خوش حال قوم کے افراد اپنے دست و بازو اور اپنی اعلیٰ اخلاقی صفات پر بھروسہ کرنے کے بجائے مال و دولت اور معاشی طاقت پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کرنے لگتے ہیں۔ مادی ترقی کے لاتعداد مواقع اور حصول دولت کے بیشمار ذرائع کی موجودگی میں مالدار اور خوشحال طبقوں کے افراد اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ ان کے اسلاف مادی وسائل اور معاشی طاقت کا جو عظیم الشان ورثہ ان کے لیے چھوڑ گئے ہیں اس کے حصول میں ان کے اخلاقی اوصاف، ان کی محنت و دیانت، ان کی مشقت اور جفاکشی، ان کی کفایت شعاری اور سادگی اور ان کے باہمی تعاون اور برادرانہ مساوات کا بڑا دخل تھا، اس لیے یہی اوصاف اور سیرت و کردار کی یہی اعلیٰ خصوصیات قوم و ملت کا اصل سرمایہ ہیں، نہ کہ وہ معاشی وسائل اور

مادی طاقتیں جو ان اخلاقی اوصاف سے ضمناً پیدا ہو گئی ہیں۔ اس حقیقت سے پہلو تہی کے باعث وہ اپنے اخلاقی کردار کی فضیلت پر نہیں بلکہ مادی وسائل اور معاشی قوتوں پر بھروسہ کرنے لگتے ہیں جس سے ان کی اخلاقی حالت رفتہ رفتہ کمزور ہونے لگتی ہے۔ ایمانداری اور دیانت کی جگہ بے ایمانی، محنت و مشقت کی جگہ کاہلی اور آرام پسندی، جرات کی جگہ بزدلی، کفایت شعاری کی جگہ اسراف اور سادگی کی جگہ ظاہری آرائش و زیبائش کا شوق بڑھنے لگتا ہے پھر اس طرز زندگی کے باعث سوسائٹی میں ظلم، ناانصافی اور زبردست آزاری کی صفات پرورش پاتی ہیں کیوں کہ ہر فرد کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ محنت اور مشقت اور تعمیر و تخلیق کے بغیر محض اپنی پوزیشن اور اثر سے دوسروں پر سبقت لے جائے پھر ان اخلاقی کمزوریوں کی وجہ سے جو خطرات سامنے آتے ہیں ان کا مقابلہ کرنے کے لیے قوم اپنی معاشی طاقت اور مادی برتری پر اعتماد کرتی ہے، حالانکہ یہ ظاہری وسائل اور قوتیں اعتماد کے قابل نہیں ہوتیں ہیں کیوں کہ قوم کا اصلی سرمایہ جس پر واقعتاً بھروسہ کیا جا سکتا ہے، اس کا اخلاقی کردار ہے اور یہی سرمایہ دولت اور عیش کی فراوانی کے سبب ضائع ہو چکا ہوتا ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غلط سہاروں پر اعتماد کر کے قوم اپنی شکست اور تباہی کا وقت قریب تر لے آتی ہے:

طبقاتی تفریق اور اتراف کے علاوہ شکست پذیر اقوام کی ایک اور صفت جس کا قرآن نے تذکرہ کیا ہے ان کا استکبار ظلم اور علو ہے۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے:

فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰيٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ٥ وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا (۲۷:۱۳-۱۴)

جب ہماری نشانیاں ان کے پاس آئیں کھلے طور پر ظاہر ہوئیں تو انھوں نے کہا کہ یہ سب جادو ہے اور ظلم اور تکبر سے ان کا انکار کیا حالانکہ دل میں انھیں یقین تھا کہ یہ نشانیاں صحیح ہیں۔

وَقَارُوْنَ وَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ وَ مَا كَانُوْا سَابِقِيْنَ (۲۹:۳۹)

اور قارون اور فرعون اور ہامان کے پاس موسیٰ ہماری کھلی ہوئی نشانیاں لے کر آیا۔ لیکن انھوں نے زمین پر تکبر کیا اور وہ ہمارے عذاب سے بھاگ نہ سکے۔

وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِی الْاَرْضِ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِیْنَ (۸۳:۱۰)

اور فرعون زمین پر رفعت و بلندی چاہنے والا تھا، اور حد سے زیادہ بڑھ جانے والا تھا۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَیْلًا وَّنَهَارًا ○ فَلَمْ یَزِدْهُمْ دُعَآءِیْۤ اِلَّا فِرَارًا ○ وَاِنِّیْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْۤا اَصَابِعَهُمْ فِیْۤ اٰذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِیَابَهُمْ وَاَصَرُّوْا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا (۷۱:۵۔۷)

نوح علیہ السلام نے کہا کہ اے میرے رب میں نے شب و روز اپنی قوم کو ہدایت کی طرف بلایا لیکن میری پکار سے وہ اور زیادہ دور بھاگنے لگے اور میں نے جب کبھی انھیں مغفرت طلب کرنے کی دعوت دی تو انھوں نے کانوں میں انگلیاں ڈال لیں اور اپنے کپڑے اپنے اوپر ڈال لیے اپنے طریقوں پر جمے رہے اور نہایت درجہ شدید تکبر میں مبتلا ہو گئے۔

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَیْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَهُمْ نَذِیْرٌ لَّیَكُوْنُنَّ اَهْدٰى مِنْ اِحْدَى الْاُمَمِ فَلَمَّا جَآءَهُمْ نَذِیْرٌ مَّا زَادَهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا ○ اسْتِكْبَارًا فِی الْاَرْضِ وَمَكْرَ السَّیِّئِ (۳۵:۴۲، ۴۳)

اور انھوں نے نہایت زور شور سے قسمیں کھائیں کہ اگر ان کے پاس کوئی ڈرانے والا آ جائے تو وہ قوموں میں سب سے زیادہ ہدایت یافتہ ہوں گے لیکن جب کوئی ڈرانے والا ان کے پاس آیا تو انھوں نے اس سے نفرت کا اظہار کیا اور زمین پر تکبر کیا اور بری تدابیر اختیار کیں۔

ان آیات میں قرآن زوال پذیر اقوام کی دو صفات بیان کرتا ہے، ایک یہ کہ ان کے اندر دنیوی سربلندی اور ظاہری شان و رفعت کا غیر معمولی شوق پایا جاتا ہے اور دوسرے یہ کہ وہ استکبار میں مبتلا ہوتی ہیں یعنی ان کی سوسائٹی میں قوی تر افراد ہر طریقہ سے کمزور اور غریب افراد پر اپنا تفوق قائم کر کے انھیں اپنے سامنے جھکانا چاہتے ہیں۔ یہ دونوں صفات دراصل ایک دوسرے سے قریبی ربط رکھتی ہیں۔ رفعت و بلندی کی طلب انسانی فطرت کا ایک قدرتی

تقاضا ہے کیوں کہ فطرت بشری فطرت الٰہی پر مبنی ہے، اس لیے اس میں علو کی طرف ایک قدرتی رجحان موجود ہے لیکن یہ رجحان جب غلط صورتیں اختیار کرتا ہے تو اس سے سوسائٹی میں ظلم اور استکبار پیدا ہوتا ہے۔ جب تک قوموں میں اور بالخصوص ان کے اعلیٰ طبقوں میں تخلیقی جذبہ موجود رہتا ہے رفعت و بلندی کی یہ طلب و آرزو تعمیر و تخلیق کی کوششوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ جس فرد میں جتنی زیادہ تخلیقی قوت اور تعمیری صلاحیت ہوتی ہے، اسی نسبت سے وہ سوسائٹی میں بلندتر مراتب حاصل کرتا ہے۔ سیاستدان اپنی سیاسی بصیرت سے قوم کو فائدہ پہنچاتے ہیں اس لیے قوم ان کو عزت و رفعت کے بلند مقامات عطا کرتی ہے۔ علما اور اہل قلم اپنے خیالات و افکار اور اپنی علمی خدمات سے قوم میں جوش عمل اور ولولہ حیات پیدا کرتے ہیں۔ اس لیے سوسائٹی ان کو امتیاز و شرف کے اعلیٰ مراتب سے سرفراز کرتی ہے۔ مالدار اور متمول اشخاص قومی تعمیر کے کاموں میں روپیہ صرف کر کے عزت و شہرت حاصل کرتے ہیں غرض کہ ہر صلاحیت اور ہر ذوق کا انسان اپنی تخلیقی جبلتوں کو بروئے کار لا کر سوسائٹی کی کوئی ایسی نمایاں خدمت انجام دیتا ہے جس سے قوم کا دل خود بخود اس کی طرف کھنچنے لگتا ہے اور لوگ بالکل فطری طریقہ پر بغیر کسی تصنع، نمائش یا ریاکاری کے اس کی عزت کرنے لگتے ہیں۔ یہی انسان کی اصلی اور فطری عزت ہے جو قدرتی صفات کی بنا پر اسے حاصل ہوتی ہے اور اس کے جذبہ خدمت اور ولولہ تخلیق کا قدرتی نتیجہ ہے اس کے لیے نہ اسے جھوٹے پروپیگنڈے کی ضرورت ہوتی ہے نہ شاعروں کی مدح سرائی اور قصیدہ گوئی کی اور نہ زرخرید اخبارات کی تعریف و توصیف کی اور نہ ہی پرتکلف ساز و سامان اور اسباب زینت و آرائش کی۔ لیکن جب قوموں اور بالخصوص ان کے مالدار اور بااثر طبقات کی تخلیقی صلاحیتیں مردہ ہو جاتی ہیں اور وہ محض اپنی اعلیٰ اخلاقی خصوصیات یا اجتماعی خدمات کے ذریعے لوگوں کا احترام حاصل نہیں کر سکتے تو انھیں اس امر کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ جس عزت اور رفعت کا استحقاق وہ اپنی صفات سے پیدا کرنے میں ناکام رہے ہیں، اسے غیر فطری اور مصنوعی طریقوں سے حاصل کریں تاکہ سوسائٹی میں ان کا سابقہ مقام قائم رہے۔ اس نوبت پر وہ اپنے لباس، اپنی رہائش اور اپنی

وضع قطع غرض کہ گردو پیش کی ہر چیز میں ایک امتیازی شان پیدا کر لیتے ہیں تا کہ ان ظاہری علامات اور امتیازات کی وجہ سے ان کے احترام میں کوئی کمی واقع نہ ہونے پائے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کسی قوم پر زوال آتا ہے تو اس کے مالدار اور بااثر طبقوں کی زندگی میں ظاہری آرائش ، مصنوعی تکلفات اور امتیازی علامات کی کوئی حد و انتہا نہیں رہتی۔ اس کے برعکس قومیں اپنے ابتدائے عروج میں طبقاتی امتیازات کی کثرت سے نا آشنا ہوتی ہیں۔ ان کے اندر امارت و غربت کا ظاہری فرق کم بلکہ تقریباً ناپید ہوتا ہے۔ ان کے بڑے بڑے لوگوں اور ممتاز لیڈروں کی زندگی میں بھی سادگی کی شان پائی جاتی ہے کیوں کہ یہ دور تخلیق اور خدمت کا دور ہوتا ہے جس میں انسان کی تعمیری صفات کی نہ کہ اس کے مال و دولت یا اقتدار و قوت کی قدر کی جاتی ہے اور قوم کے ممتاز افراد محض اپنی فطری صلاحیتوں اور جذبہ تعمیر و تخلیق کی بنا پر عزت و احترام کے مستحق قرار دیے جاتے ہیں۔ اپنا احترام اور وقار قائم رکھنے کے لیے انھیں کسی منصوعی سہارے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن جب یہ دور ختم ہو جاتا ہے تو قوم کے بالاتر طبقے جنھوں نے اپنی اعلیٰ خدمات اور تعمیری صفات سے سوسائٹی میں ایک امتیازی مقام پیدا کیا تھا اس کو قائم رکھنے کے لیے منصوعی سہارے تلاش کرتے ہیں۔ اپنی سکونت کے لیے بڑے بڑے عالیشان قصر اور محل تعمیر کرتے ہیں۔ گھر سے باہر نکلتے ہیں تو کبھی محافظ دستے ان کے آگے پیچھے ہوتے ہیں اور کبھی مصاحبوں، خوشامدیوں اور سرکاری عہدہ داروں کے غول در غول ان کی مشایعت کرتے ہیں۔ ان کی سواری نکلتی ہے تو غیر معمولی انتظامات کے ساتھ شاہانہ تکلفات اور امیرانہ ٹھاٹھ کے بغیر وہ عوام الناس کے سامنے آتے ہوئے جھجکتے ہیں۔ ان کا لباس شاہانہ جاہ و حشم کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ان کی وضع قطع نشست و برخاست اور انداز گفتگو میں تصنع اور غیر فطری نزاکت پیدا ہو جاتی ہے۔ مختصر یہ کہ سوسائٹی کے بالاتر طبقات طرح طرح کے مصنوعی طریقوں سے عوام الناس کے مقابلہ میں اپنا امتیاز و تفوق برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تا کہ وہ مقام عزت جو ان کے اسلاف نے صرف اپنی تعمیری خدمات اور تخلیقی صلاحیتوں کے ذریعے حاصل کیا تھا ان کے ہاتھ سے جانے نہ پائے، حالانکہ دراصل

وہ اپنی فطری صلاحیتوں کی کمی اور جذبہ تعمیر و خدمت کے فقدان کے باعث اس مقام کو کھو چکے ہوتے ہیں اور دراصل یہی احساس کمتری کہ وہ اب اس عزت کے اہل نہیں ہیں انھیں ظاہری تکلفات اور زینت و آرائش کے مصنوعی طریقے اختیار کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ تاکہ اپنی تخلیقی صفات کی کمی پر وہ ان ظاہری امتیازات و علامات کے پردے ڈال دیں۔ اسی ذہنی کیفیت کو قرآن علو اور استکبار سے تعبیر کرتا ہے اور اسے ایک صفت زوال اور علامت انحطاط قرار دیتا ہے کیوں کہ اس ذہنیت اور طرز فکر کا ایک ناگزیر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سوسائٹی کے کم حیثیت افراد اپنی معاشی پستی کے باعث زینت و تفاخر کے ظاہری اسباب سے محروم ہو کر ان کے مقابلہ میں اپنے آپ کو ذلیل و خوار سمجھنے لگتے ہیں اور یہ کوشش کرتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح وہ بھی یہ تمام ظاہری وسائل اور خارجی اسباب زینت و آرائش حاصل کر کے عزت داروں کے زمرہ میں شامل ہو جائیں۔ اس طرح مالدار طبقات اور غریب طبقے دونوں تملیکی جذبات سے مغلوب ہو جاتے ہیں، ان کی تعمیری صلاحیتیں اور تخلیقی جبلتیں روز بروز خشک اور افسردہ ہونے لگتی ہیں اور جذبہ خدمت یا جوش تعمیر کی جگہ آرائش و زیبائش اور اظہار شان کا جذبہ فروغ پانے لگتا ہے یہاں تک کہ قوم کا ہر فرد دوسرے پر اپنی بڑائی کا سکہ جمانا چاہتا ہے۔ اس طرح برادرانہ تعاون اور احساس اخوت کی بجائے سوسائٹی میں رشک و حسد کے جذبات عام طور پر بھڑک اٹھتے ہیں اور پوری قومی زندگی ایک وسیع دنگل کا منظر پیش کرنے لگتی ہے جس میں ہر قسم کے بڑے چھوٹے پہلوان ایک دوسرے کو پچھاڑنے میں لگے رہتے ہیں۔ مالدار طبقے زیادہ سے زیادہ دولت اس لیے حاصل کرنا چاہتے ہیں کہ وہ اپنی امتیازی علامات، اپنے اسباب زینت و آرائش اور اپنی ظاہری شان و شوکت میں اضافہ کریں اور عوام الناس کے مقابلہ میں زیادہ سے زیادہ بڑائی جتا سکیں۔ غریب اور متوسط طبقات مال و دولت کی ہوس میں اس لیے گرفتار ہو جاتے ہیں کہ اب سوسائٹی میں عزت و احترام پیدا کرنے اور ذلت و حقارت سے محفوظ رہنے کا اور کوئی طریقہ باقی نہیں رہتا۔ بجز اس کے کہ آدمی مال و دولت کے اعتبار سے ممتاز اور حکمران طبقہ کی سرپرستی سے آبرودار ہو۔ کیوں کہ ایسے زمانہ میں تعمیری صفات اور تخلیقی

صلاحیتوں کی کوئی قدر نہیں رہتی جن کی بخشش اور تقسیم میں قدرت اتنی فیاض ہے کہ وہ مالدار اور حکمران طبقات کے ساتھ کوئی مخصوص رعایت نہیں برتتی۔ غرض کہ قوموں کے دورِ زوال و انحطاط میں صرف روپیہ پیسہ، مال و دولت اور مصنوعی اعزازت و مناصب افرادِ انسانی کے شرف و عزت کا معیار قرار پاتے ہیں۔ ہر شعبہ زندگی میں تعمیری کاموں اور تخلیقی سرگرمیوں پر افسردگی چھائی رہتی ہے اور لوگوں پر مادیت اور زرپرستی کا اتنا غلبہ ہوتا ہے کہ ہر فرد کو شب و روز صرف یہی فکر رہتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح وہ اپنی دولت میں اضافہ کر کے یا عہدہ میں ترقی کر کے سوسائٹی میں زیادہ سے زیادہ شرف و امتیاز حاصل کرے۔ جب انسان کا مرتبہ اور مقام اس طرح مادی اور معاشی پیمانوں سے ناپا جائے جانے لگتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غریب اور متوسط طبقات مزید زیادہ معاشی مصائب اور مالی مشکلات میں مبتلا ہوتے چلے جاتے ہیں کیوں کہ اکتسابِ زر اور حصولِ دولت کی اس دوڑ میں اسی طبقہ کے افراد کو کامیابی کا موقع ملتا ہے جس کے ہاتھ میں قوم کا سیاسی اقتدار ہو پھر یہ طبقہ چوں کہ اپنے اسبابِ عیش، اظہارِ تفوق اور سامانِ زینت کے لیے زیادہ سے زیادہ مال و دولت خود حاصل کرنا چاہتا ہے، اس لیے قومی دولت کا بہت کم کم حصہ متوسط اور غریب طبقات کے ہاتھ آسکتا ہے۔ اگر تملکی جذبات کے ساتھ ساتھ کچھ تعمیری صفات اور تخلیقی جذبات بھی موجود ہوں تو قوم کی مجموعی دولت میں اضافہ ہوسکتا ہے اور اس اضافہ سے متوسط اور غریب طبقات کو بھی فائدہ پہنچ سکتا ہے لیکن چوں کہ تخلیقی سرگرمیاں اور تعمیری کوششیں طلبِ زر اور حصولِ اقتدار کی جدوجہد میں سرد پڑ جاتی ہیں، اس لیے قومی دولت میں اضافہ ہونے کی جگہ اور زیادہ کمی ہونے لگتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دولت مند طبقوں کے اسبابِ عیش اور سامانِ آرائش پر قومی دولت کا جتنا زیادہ حصہ صرف ہوتا جاتا ہے اسی نسبت سے متوسط اور غریب آدمیوں کی معاشی حالت خراب ہوتی جاتی ہے، اس طرح استکبار اور علو جن کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے ایک ایسی قوم کی صفات میں جس میں تعمیر و تخلیق کی بجائے مال و دولت کو معیارِ عزت قرار دے دیا گیا ہو اور قوم کے مالدار اور بااثر طبقات اپنی مصنوعی شان و شوکت اور امتیازی علامات کو

برقرار رکھنے یا ان میں اضافہ کرنے کے لیے قومی دولت کا زیادہ سے زیادہ حصہ صرف کر کے متوسط اور غریب طبقات کا خون چوستے ہوں۔ ایسی سوسائٹی میں بجائے اس کے کہ لوگ اپنے جذبہ تعمیر اور جوش تخلیق کے ذریعے قوم کے خزانہ کو نئی نئی ایجادات وو اختراعات اور فتوحات ذہنی و مادی سے بھرپور کریں، اس میں سے ہر شخص ہاتھ ڈال کر اتنا کچھ نکال لیتا ہے کہ تھوڑے ہی دنوں میں یہ خزانہ خالی نظر آنے لگتا ہے۔

استکبار یعنی مصنوعی امتیاز و تفوق کی سعی و طلب سوسائٹی میں ایسے آداب و رسوم اور ظاہری طریقے پیدا کرتی ہے جو کم حیثیت افراد معاشرہ کی تذلیل و تحقیر کا موجب بن جاتے ہیں۔ اس لیے ایسا معاشرہ جس پر استکبار کا رنگ غالب ہو، رفتہ رفتہ خوددار انسانوں کے وجود سے خالی ہو جاتا ہے کیوں کہ جو لوگ اس جھوٹی شان اور مصنوعی تفریق کو خاطر میں نہیں لاتے، اور محض قلت مال یا دنیوی مناصب اور عہدوں سے محرومی کے باعث اپنے آپ کو کمتر تصور کرنے پر تیار نہیں ہوتے بلکہ انسانوں کو ان کے جذبہ تعمیر و تخلیق کے پیمانہ سے جانچتے ہیں وہ متکبرین کی ناراضگی اور جوش انتقام کا شکار ہو کر معاشی ترقی اور دنیوی اعزاز سے محروم ہو جاتے ہیں۔ ان کی جگہ دنیوی اعزازات و مناصب ان لوگوں کو ملتے ہیں جو اپنی ذاتی خودداری کو قربان کر کے جھوٹی خوشامد اور تعریف و توصیف کے عادی ہوں۔ اس طرح ظاہر پسندی، ریا کاری، منافقت، بے جا خوشامد، غرض کہ جھوٹ کی تمام صورتیں سوسائٹی میں فروغ پانے لگتی ہیں۔ صداقت پسند اور خوددار طبائع جو ان باتوں کو پسند نہیں کرتے روز بروز معاشی حیثیت سے تنگ حال اور سیاسی اعتبار سے گم نام اور بے اثر ہو جاتے ہیں۔ سچائی اور حق پسندی اپنی تمام شکلوں میں جھوٹ اور منافقت کے اس طوفان میں بہہ جاتی ہے۔ دین و مذہب کو بھی اخلاق اور نیک کرداری کے اصولوں پر جانچنے کے بجائے لوگ ظاہری رسوم و شعائر کے رنگ میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس لیے دینی اور مذہبی حیثیت سے بھی انھیں لوگوں کا زور ہوتا ہے جو اصلی اخلاق سے بالکل عاری لیکن ظاہری علامات دینداری سے آراستہ و پیراستہ ہوتے ہیں۔

اس طرح دولت و اقتدار کی پرستش انسان کو صداقت پسندی سے ہٹا کر اس میں سے یہ قابلیت

فنا کر دیتی ہے کہ وہ حقیقت کو اوہام وخرافات اور ظاہری نمائش کی چیزوں سے متمیز کر سکے اور زندگی کی حقیقی اقدار یعنی تعمیر و تخلیق اور خدمت خلق کو اس کا جائز مقام عطا کرے۔ اسی حقیقت کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

وَقَالَ مُوسٰى رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَ مَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ (۱۰:۸۸)

ترجمہ: اے ہمارے رب تو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو دنیوی زندگی کے مال و متاع اور اس کی ظاہری زینتوں سے مالا مال کر دیا ہے تا کہ وہ تیری راہ سے ہٹ جائیں۔

یعنی فرعون اور اس کے سرداروں کو مال و دولت اور جاہ واقتدار کی جو فراوانی عطا کی گئی ہے وہ انھیں راہ حق سے اور زیادہ دور ہٹا دینے کی موجب بن گئی ہے۔ انھوں نے اخلاقی اقدار و معیارات کا پورا نظام الٹ کر رکھ دیا ہے۔ اجتماعی زندگی کے لیے جو چیزیں واقعی اہمیت رکھتی ہیں یعنی انسان کا جذبۂ خدمت اور اس کی تعمیری اور تخلیقی صلاحیتیں ان کے بجائے یہ لوگ مال و دولت اور ظاہری اسباب نمائش کو اصل حقیقت سمجھ بیٹھے ہیں اور انھی چیزوں کے ہونے نہ ہونے پر انسان کے معاشرتی مرتبہ اور اس کی عزت اور قدر و منزلت کا دارومدار رکھتے ہیں۔ اس طرح مال و دولت اور اسباب عیش کی پرستش نے ان کی اجتماعی بصیرت زائل کر کے انھیں سچائی سے بیگانہ بنا دیا ہے۔

جب سوسائٹی پر زر پرستی اور ہوس اقتدار کی یہ کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور اس کے افراد مادی اقدار حیات کے پرستار بن جاتے ہیں تو یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی کہ کوئی ایسا شخص جس کا سوسائٹی کے اعلیٰ طبقہ سے تعلق نہ ہو اور جو مال و دولت کے اعتبار سے کوئی خاص فضیلت نہ رکھتا ہو، حق اور صداقت کا مبلغ کیسے بن سکتا ہے یا قوم اس کی لیڈر شپ کیسے قبول کر سکتی ہے۔ مادی طاقت اور معاشی قوت کی پرستش کرتے کرتے ان کا طرز فکر اتنا غلط ہو جاتا ہے کہ وہ یہ نہیں دیکھتے کہ جو بات ان سے کہی جا رہی ہے وہ فی نفسہٖ صحیح ہے یا غلط بلکہ وہ یہ دیکھتے ہیں کہ بات کون کہہ رہا ہے۔ کہنے والے کا تعلق کس طبقہ سے ہے۔ آیا وہ دنیوی

حیثیت سے عزت دار اور معاشی حیثیت سے مالدار ہے یا نہیں۔ اگر وہ اسے دنیوی عزت وجاہت سے محروم پاتے ہیں تو اس کی بات کو حق تسلیم کرنے سے انکار کر دیتے ہیں کیوں کہ وہ حق کو اشخاص اور طبقات کے ذریعے پرکھنا چاہتے ہیں۔ قوم نوح اور بنی اسرائیل کی اسی ذہنیت کو بے نقاب کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے:

فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ ۢ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ (۱۱:۲۷)

قوم نوح کے سرداروں نے جنھوں نے کفر کیا تھا نوح علیہ السلام سے کہا کہ ہم تجھے ایک معمولی انسان ہی پاتے ہیں اور جو لوگ تیرے پیرو ہیں وہ تو انھی افراد پر مشتمل ہیں جن کو ہم رذیل سمجھتے ہیں اور ہم تم لوگوں میں کوئی فضیلت نہیں دیکھتے بلکہ تمھیں جھوٹا خیال کرتے ہیں۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ط قَالُوْٓا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَ نَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ (۲: ۲۴۷)

بنی اسرائیل کے نبی نے کہا کہ اللہ نے تمھارے لیے طالوت کو بادشاہ بنا کر بھیجا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس کو حکومت کس طرح مل سکتی ہے اس سے زیادہ حکومت کے حق دار تو ہم ہیں کیوں کہ اسے مال و دولت کی فراوانی حاصل نہیں ہے۔

پہلی آیت میں قرآن نے بتایا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے انکار اس لیے کیا کہ ان کے ماننے والے غریب طبقہ کے افراد تھے اور دنیوی حیثیت سے ذلیل وخوار سمجھے جاتے تھے جب قوم نوح کے سرداروں نے آپ سے یہ کہا کہ ہم تمھارے اندر کوئی فضیلت نہیں پاتے تو فضیلت سے ان کی مراد یہ تھی کہ نہ تو مال و دولت کے اعتبار سے تم ممتاز ہو اور نہ منصب یا عہدہ کے لحاظ سے تم کو کوئی تفوق حاصل ہے۔ دوسری آیت میں بنی اسرائیل اس امر پر اظہار تعجب کرتے ہیں کہ طالوت کو ان کا لیڈر بنانے کی تجویز کی جارہی ہے حالانکہ معاشی حیثیت سے وہ کسی خاص مرتبہ کا حامل نہیں ہے۔ یہ دونوں طرز فکر قوم نوح اور بنی اسرائیل کی انحطاط پذیر

ذہنیت کے آئینہ دار ہیں اور ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان دونوں قوموں پر مادی اقدار کی پرستش کتنی بری طرح چھائی ہوئی تھی اور کس طرح وہ انسان کی تخلیقی جبلتوں، تعمیری صلاحیتوں اور جذبہ خدمت کے بجائے اس کی تملیکی قوتوں کو معیار عزت سمجھتے تھے۔

جب تعمیر و تخلیق کی ٹھوس حقیقت کے بجائے دولت، ملکیت، عہدے اور سیاسی مناصب سوسائٹی میں غیر معمولی اہمیت اور مبالغہ آمیز وزن حاصل کر لیتے ہیں تو ہر شعبہ حیات میں نمائش، ظاہر داری اور بے روح ضابطہ پرستی کی خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں۔ حکومت کے دفاتر سے لے کر کالجوں، مدرسوں، مذہبی اداروں یہاں تک کہ گھریلو زندگی میں بھی اس ظاہر پرستی کے علامات وآثار نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ سرکاری دفاتر کی کثرت، ان کی عمارتوں کی شان و وسعت یا عہدہ داران اور کارکنان نظم و نسق کی تعداد کو دیکھ کر بادی النظر میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ حکومت کی مشینری پوری قوت اور تیزی سے سرگرم کار ہے لیکن حقیقت اس کے برخلاف ہوتی ہے۔ ظاہری قواعد وضوابط کی جکڑ بندیوں اور نمائشی کاموں کے سوا اصل تعمیری کام سے کسی کو دلچسپی نہیں رہتی۔ قواعد و ضوابط اس لیے نہیں بنائے جاتے تاکہ اجزائے کار میں سہولت ہو اور حاجت مندوں کی ضروریات و شکایات پر جلد توجہ کی جاسکے۔ اس کے بجائے قوانین اور قاعدوں کی یہی کثرت کارروائیوں کے التوا یا تاخیر کا سبب بن جاتی ہے پھر اکثر اوقات انہی قواعد اور ضابطوں کی آڑ لے کر قانون کے اصل منشا اور مقصد کی خلاف ورزی کی جاتی ہے۔ اوقات کی سخت پابندی سے بظاہر یہ محسوس ہوتا کہ کارکنان حکومت ہر وقت اپنا کام انجام دیتے ہیں لیکن جب ضرورت مند افراد کو ان سے عملاً سابقہ پڑتا ہے تب معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک ظاہری نمائش ہے، حقیقت میں کارکنان حکومت کام کرنے کے بجائے اپنا زیادہ وقت فضولیات اور تفریحی مشاغل میں ضائع کر دیتے ہیں۔ مدارس اور کالجوں میں بھی تعلیم کا ظاہری نظام بڑا دلفریب اور مرعوب کن ہوتا ہے۔ رجسٹروں کی کثرت، اوقات کی پابندی، تصاویر اور نقشہ جات کے استعمال، طلبا کی نصابی کتب اور مضامین کی تعداد، امتحانوں کی چہل پہل، اساتذہ کی ڈگریوں اور تعلیمی کھیلوں اور ڈراموں

سے دیکھنے والے پر فوری اثر یہ ہوتا ہے کہ تعلیم کا معیار بہت بلند اور اساتذہ کی کارکردگی بڑی عمدہ ہے۔ لیکن اگر ان ظاہری پردوں کو اٹھا کر اندر دیکھا جائے تو حقیقت کچھ اور نظر آتی ہے۔ تعلیم کی اصل روح یعنی اساتذہ اور معلمین کا جذبہ خدمت اور طلبا کی اکتسابی اہلیت دونوں کا معیار گر جاتا ہے۔ معلموں اور متعلموں کو رسمی خانہ پری اور حاضر باشی کے سوا تعلیم و تعلم کے اصل کام سے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہتی۔ یہی حال ہسپتالوں اور کارخانوں کا ہوتا ہے کہ ہر جگہ کام کم اور نمائش زیادہ ہو جاتی ہے۔ دوا خانوں میں ساز و سامان کی کثرت، ڈاکٹروں و نرسوں کی بڑھتی ہوئی تعداد اور دیگر ظاہری سہولتوں کو دیکھ کر بظاہر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ قوم کا نظام صحت بڑے حسن و خوبی سے چل رہا ہے۔ لیکن مریضوں کو جو تلخ تجربات پیش آتے ہیں ان سے اس کی تکذیب ہوتی ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹروں، نرسوں اور دوسرے ہسپتالی عملہ میں انسانی ہمدردی اور خدمت خلق کا جذبہ فنا ہو چکا ہے اور یہ لوگ روپیہ پیسہ کے لالچ یا ترقی کی خوش آئند توقعات کو مدنظر رکھ کر صرف بااثر اشخاص اور متمول افراد کے علاج و معالجہ پر توجہ کرتے ہیں جبکہ متوسط یا غریب طبقہ کے مریضوں کے ساتھ دل کھول کر بے اعتنائی برتتے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض صورتوں میں اس عدم توجہ اور بے التفاقی کے باعث غریب طبقہ کے مریض لقمہ اجل بن جاتے ہیں۔

گھریلو زندگی میں یہ ظاہر پرستی، لباس کی تراش و خراش، فرنیچر کی آراستگی اور غذاؤں کے تنوع میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ بے ہودہ رسموں اور غیر ضروری روایات کی پابندی پر بہت زیادہ توجہ کی جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے لوگ تعمیر و تخلیق کے کاموں میں دل لگانے کی بجائے اس فکر میں مبتلا رہتے ہیں کہ ان کے لباس میں تو کوئی خامی نہیں رہ گئی ہے۔ ان کا مکان، فرنیچر اور ساز و سامان سے مکمل طور پر آراستہ ہے یا نہیں۔ مہمانداری کے طریقوں میں کوئی نقص تو نہیں ہے۔ بزرگوں، دوستوں اور ملاقاتیوں کے ظاہری احترام اور خاطر داری میں تو کوئی خلا باقی نہیں رہ گیا ہے۔ شادی بیاہ اور موت و پیدائش کے وقت ضروری رسوم و رواج کی پابندی کی جاتی ہے یا نہیں۔ غرض کہ یہی تمام ظاہری امور مردوں

اور عورتوں کی دلچسپی اور توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں اور انھیں بعض وقت اتنی اہمیت دی جاتی ہے کہ ان کی وجہ سے خاندانی تعلقات بگڑ جاتے ہیں اور طرح طرح کے جھگڑے اور فسادات اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

مذہبی زندگی میں ظاہر پرستی کا یہ شوق تقویٰ اور تورع کی ان شکلوں میں نمودار ہوتا ہے جن کے پس پشت دینی خلوص اور مذہبی اخلاص کی کوئی طاقت نہیں ہوتی۔ لوگوں کی مذہبیت اس نقطہ نظر سے جانچی جاتی ہے کہ ان کے چہرہ پر داڑھی اور ٹانگوں میں اونچا پاجامہ ہے یا نہیں۔ بقر عید کی قربانی کرتے ہیں یا نہیں۔ بزرگوں، پیروں اور اولیائے کرام سے ان کی عقیدت کا کیا حال ہے۔ فاتحہ اور درود پر عقیدت رکھتے ہیں یا وہابیت کی طرف مائل ہیں۔ نماز روزہ میں سستی یا تاخیر تو نہیں کرتے ہیں۔ اگر مالدار آدمی ہو تو اس کے متعلق سوال کیا جاتا ہے کہ اس نے حج کتنی مرتبہ کیا ہے، میلاد کی کتنی محفلیں منعقد کر چکا ہے اور رمضان کے مہینے میں اس کے گھر سے افطاری مسجد بھیجی جاتی ہے یا نہیں۔ اس کے برعکس سچی خدا ترسی، قانون جزا و سزا کا خوف، معاملات کی درستگی، فرض شناسی، وقت کی قدر و قیمت کا احساس، فضولیات سے احتراز، خدمت خلق کا جذبہ، تعمیر و تخلیق کا ولولہ، کسی اچھے مقصد کے لیے مالی ایثار کرنا اور بڑے بڑے اعزازات و مناصب اور عہدوں کو ٹھکرا دینا، دنیا کی زندگی کی لذتوں اور مسرتوں کو اعلیٰ مقاصد پر قربان کر دینا یہ تمام چیزیں جو مذہب کی روح اور دین کا نچوڑ ہیں ظاہر پرست دینداروں کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ حکومت کے نظم و نسق کی طرح مذہبی قواعد و ضوابط کی کثرت میں بے انتہا اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ غیر ضروری اور غیر فطری پابندیوں سے تنگ آ کر ذہین لوگ مذہب سے باغی ہو جاتے ہیں حالانکہ قواعد و ضوابط کی اس ظاہری حرمت کے باوجود انھی قاعدوں اور ضابطوں کی مدد سے دوسرے اہم تر اور زیادہ بنیادی قوانین مذہب کی خلاف ورزی کی جاتی ہے۔

تعمیر و تخلیق کا جوش سرد پڑ جانے اور تملیکی جذبات کے غالب آ جانے سے لوگوں کے اندر مال و دولت کے متعلق جو نقطہ نظر پیدا ہو جاتا ہے اس کا حال قرآن کریم نے قوم مدین

کے واقعہ میں بیان کیا ہے۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے:

قَالُوْا یٰشُعَیْبُ اَصَلٰوتُکَ تَاْمُرُکَ اَنْ نَّتْرُکَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِیْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا (۱۱:۸۷)

انھوں نے کہا اے شعیب علیہ السلام کیا تیری عبادت کے طریقہ میں یہ بھی ضروری ہے کہ ہم ان معبودوں کو چھوڑ دیں جنھیں ہمارے آباؤ اجداد پوجتے تھے اور ہم اپنے مال و دولت کے استعمال میں آزاد ہوں۔

اس آیت میں قوم شعیب کی ذہنیت کا ذکر کیا گیا ہے کہ کس طرح اس قوم کے مالدار افراد اپنی کمائی ہوئی دولت میں کسی قسم کے معاشرتی اور اجتماعی حقوق تسلیم کرنے سے گریز کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ اپنی جائیداد، ملکیت اور روپیہ پیسہ کے استعمال میں بالکل آزاد اور غیر پابند رہیں۔ جس طرح چاہیں انھیں خرچ کریں اور کوئی پوچھنے والا نہ ہو کہ ہم نے کیا خرچ کیا اور کتنا بے جا صرف کیا یا روپیہ پیسہ کو صحیح مصرف میں لائے۔ اپنی کمائی کو عیش ولذت کے سامان اور زینت وتفاخر کے اسباب پر اڑا دیا یا سوسائٹی کے غریب اور پریشان حال افراد کے حقوق اور قومی تعمیر کی ضروریات کا بھی لحاظ کیا۔ مال و دولت اور تمام ذہنی اور اخلاقی صلاحیتوں کے بارے میں زوال پذیر اقوام کا نقطہ نظر یہ ہوتا ہے کہ ان کے استعمال میں جائز وناجائز اور حرام اور حلال کے تمام قیود وحدود غیر فطری اور مصنوعی ہیں۔ اس لیے وہ اپنے جسم، اپنی عقل اور اپنے مال و دولت کو جس مقصد پر چاہیں صرف کر سکتے ہیں۔ جب انھیں بتایا جاتا ہے کہ روپیہ پیسہ ہو، یا انسان کی ذہنی جسمانی اور عقلی ثروت، ان کا مصرف صحیح ہونا چاہیے۔ غلط مقاصد، فضول کاموں اور شخصی یا خاندانی اغراض کی خاطر مالی، معاشی اور ذہنی قوتوں کو ضائع کر دینا انسانیت کے حقوق کو پامال کرنا ہے تو وہ اس قسم کی پابندیوں کو قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ ان کا استدلال بالعموم یہ ہوتا ہے کہ یہ سب چیزیں ہم نے اپنی ذاتی جدوجہد اور محنت سے پیدا کی ہیں۔ اس لیے ہم آزاد ہیں کہ جس مقصد کے لیے چاہیں انھیں صرف کریں اور جس طرح چاہیں ان کا استعمال کریں۔ یہ

لوگ اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ انسان اپنی محنت اور جدوجہد سے ایک دانہ بھی اگا نہیں سکتا۔ اگر فطرت نے پہلے سے اس کے اندر کچھ صلاحیتیں اور قابلیتیں ودیعت نہ کر دی ہوں اور پھر خارج میں اسباب و وسائل کا سلسلہ پیدا نہ کر رکھا ہو۔ انسان کی مادی دولت ہو یا ذہنی قابلیت ان میں سے کوئی چیز بھی وہ از خود پیدا نہیں کرتا۔ کارساز فطرت اس کے اندر اکتساب اور جدوجہد کی جو صلاحیت رکھ دیتا ہے اور جن مخصوص ملکات سے اسے مالا مال کرتا ہے انھی کی بنا پر وہ دنیوی ترقی کا پہلا قدم اٹھا سکتا ہے۔ اس لیے خارج میں جو وسائل اور قوتیں ہم حاصل کرتے ہیں، خواہ وہ ہماری علمی فضیلت ہو فنی مہارت ہو، یا مال و دولت اور سیاسی طاقت ہو وہ سب قدرت کے عطیات ہیں۔ جو معاشرتی اور اجتماعی اغراض کی خدمت کے لیے وہ ہمارے سپرد کرتی ہے نہ کہ ہماری ذاتی بڑائی، شخصی عیش و راحت یا خاندانی عظمت و رفعت کے لیے۔ جو شخص اجتماعی اغراض اور معاشرتی مفاد کو ملحوظ رکھے بغیر یا ان مقاصد کے بالکل خلاف اپنی ذہنی، فنی، معاشی یا دیگر صلاحیتوں کو بروئے کار لاتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ چونکہ ہم نے ذاتی جدوجہد سے مال و دولت، سیاسی طاقت یا علمی فضیلت حاصل کی ہے اس لیے اب ہم آزاد ہیں کہ دوسرے انسانوں کے حقوق اور معاشرتی اغراض سے بے نیاز ہو کر ان کو جس طرح چاہیں استعمال کریں، وہ منشائے قدرت کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور اپنی فطرت صحیحہ سے باغی ہیں۔ جب تک قوموں کا تعمیری جوش اور تخلیقی وجدان بیدار رہتا ہے ان کے افراد اپنے مال و دولت، اپنے علم و فضل اور اپنی سیاسی قابلیت کو ذاتی ملکیت نہیں سمجھتے ہیں بلکہ انھیں مذہبی، معاشرتی اور اجتماعی مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ ہر ترقی پذیر قوم کی یہ صفت ہوتی ہے کہ اس کے مالدار لوگ، اس کے اہل علم اور سیاسی لیڈر اپنے مال و دولت، علم و فضل اور سیاسی بصیرت کا بڑا حصہ صرف ذاتی بڑائی اور ترقی یا خاندانی عظمت و ناموری کے لیے نہیں بلکہ قومی مقاصد کی خدمت کے لیے صرف کرتے ہیں لیکن جب قوم پر تعمیری اور تخلیقی احساسات کے بجائے تملیکی جذبات غالب آ جاتے ہیں تو لوگ ان تمام وسائل کو صرف

اپنی ذات یا اپنے خاندان کے مفاد کی خاطر استعمال کرتے ہیں اور تعمیری ضروریات یا کمزور افراد معاشرہ کے حقوق کا لحاظ کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ اس کی مثال ہمیں موجودہ سرمایہ داری کی تاریخ میں بھی ملتی ہے۔ جب تک یورپ اور امریکہ کی سرمایہ دار قومیں ترقی پذیر تھیں اور ان میں تخلیقی جوش موجود تھا، ان کے سرمایہ دار اور متمول افراد اپنی ذاتی دولت قومی اور اجتماعی اغراض کے لیے بے دریغ صرف کرتے تھے۔ کہیں ان کے روپیہ پیسہ سے سائنٹفک ادارے قائم ہوتے تھے جن میں سائنسدان اور ماہرین فن تحقیقات و تجربات کر کے نئی نئی ایجادات واختراعات کے انبار لگا دیتے تھے۔ کہیں تاریخی، تمدنی اور ثقافتی انجمنیں قائم کی جاتی تھیں جن میں اہل علم معاشرتی اور تاریخی مسائل پر غور و خوض کرتے تھے۔ کہیں صنعتی توسیع کے لیے بڑے بڑے عظیم الشان کارخانے بنائے جاتے۔ کہیں خیراتی اسپتالوں اور صحت گاہوں کی تعمیر کے لیے سرمایہ دار اپنا روپیہ وقف کرتے۔ کہیں غیر سرکاری مدارس کھولے جاتے تاکہ فن تعلیم میں نئے نئے تجربات عمل میں آئیں، غرض کہ ان ملکوں کے سرمایہ دار طبقہ میں تعمیر و تخلیق کا ایک بے پناہ جذبہ تھا جس کی وجہ سے وہ قومی اور اجتماعی کاموں میں روپیہ لگانے کو ضروری اور مفید سمجھتے تھے اور ان کے دل میں یہ غرور اور تکبر کبھی نہیں پیدا ہوتا تھا کہ روپیہ پیسہ ہماری ذاتی ملکیت ہے۔ لہٰذا ہم یہ پابندی قبول نہیں کر سکتے ہیں کہ اسے اجتماعی اغراض یا غریبوں کی خدمت کے کام میں لگائیں بلکہ ہم اسے ذاتی عیش و راحت کے سامان اور اظہار زینت و شان کے وسائل پر صرف کر دینے میں بالکل حق بجانب ہیں لیکن انھی قوموں پر جب سے زوال آنا شروع ہوا تو ان کے سرمایہ داروں، عالموں اور فنی ماہرین غرضیکہ ہر صاحب فضیلت کا نقطۂ نظر بدل گیا۔ چنانچہ اب ایسے سرمایہ داروں کی تعداد بہت کم رہ گئی جن کا روپیہ پیسہ قومی کاموں یا غریبوں کے مفاد پر صرف ہوتا ہو۔ یہ لوگ اپنے مال دولت کو یا تو مزید آمدنی کے حصول کی خاطر صرف کرتے ہیں یا اپنے آرام وراحت اور عیش و عشرت کا سامان مہیا کرنے کے لیے اور اگر کسی وجہ سے انھیں یہ دونوں صورتیں ناپسند ہوں تو اپنا روپیہ بینکوں میں بیکار جمع

رکھتے ہیں لیکن انھیں یہ گوارا نہیں ہے کہ ان کی دولت قوم و ملک کے غریب و نادار افراد کے کام آئے۔ اسی طرح قوموں کے علما اور فضلا، فنی ماہرین اور سیاستدان اپنی ذاتی شہرت اور نام ونمود، اپنی شخصی وجاہت یا خاندانی بڑائی کے پیچھے سرگرداں ہیں اور اپنی اعلیٰ ترین ذہنی اور اخلاقی صفات کو شخصی اور خاندانی اغراض کی ترقی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ نہ علما کا علم قوم کے کام آتا ہے نہ فنی ماہرین کی مہارت اور نہ لیڈروں کی سیاسی بصیرت جب تک اس سے انھیں ذاتی فائدہ کی توقع نہ ہو۔ منفعت پرستی کا جذبہ اور تملیکی جبلتوں کا یہ قہرمانہ غلبہ تعمیر اور تخلیق کی تمام راہیں مسدود کر رہا ہے۔ جس قوم پر ایسی تنگ نظرانہ منفعت پرستی اور ہوس تملیک غالب آ جائے اس میں تعمیر و تخلیق اور معاشرتی سود و بہبود کے کام یا تو رکے پڑے رہتے ہیں یا بالکل بند ہو جاتے ہیں کیوں کہ لوگوں کا نقطہ نظر مال و دولت اور ذہنی صلاحیتوں کے متعلق وہی ہو جاتا ہے جس کا قرآن نے قوم مدین کے سلسلہ میں ذکر کیا ہے یعنی یہ مال و دولت اور یہ ذہنی صلاحیتیں ہماری ذاتی جدوجہد کا نتیجہ ہیں، اس لیے دوسروں کو ان کے فوائد سے مستفید ہونے کا کوئی حق نہیں پہنچتا اور ہم اس امر میں بالکل حق بجانب ہیں کہ ان تمام چیزوں کو صرف اپنے ذاتی آرام ولذت، شخصی اغراض اور خاندانی مفاد کے لیے صرف کریں۔ مذہب کے داعیوں اور اخلاق کے مبلغوں کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ہم پر اخلاقی، معاشرتی یا مذہبی اصولوں کے نام سے کوئی پابندی عاید کریں۔ قرآن کہتا ہے کہ یہی آزادروی اور انانیت، یہی منفعت پرستی اور تخلیقی افلاس قوموں کو زوال ونکبت کی طرف لے جاتا ہے۔

پھر اسی جذبہ تعمیر اور جوش تخلیق کی کمی کے باعث زوال پذیر طبقات واقوام میں کورانہ تقلید کا مرض پیدا ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ نہ تو کسی نئی بات کو سن سکتے ہیں اور نہ اس پر غور کر سکتے ہیں۔ مادی زندگی کی دلچسپیوں میں انہماک کے سبب سے ان کا ذہنی افق اتنا تاریک اور ان کی سطح عقل اتنی پست ہو جاتی ہے کہ خود تو کسی نئے طریقے کی دریافت کرنا یا نئی بات کا انکشاف کرنا درکنار اگر کوئی تخلیقی ذہن یا تعمیری دماغ ان کے سامنے کوئی اچھوتا تخیل پیش

کرے تو خواہ اس میں کتنی ہی زبردست سچائی ہو وہ اسے ایک بدعت سمجھ کر نہ صرف رد کر دیتے ہیں بلکہ پورے زور و شور سے اس کی مخالفت اور تردید کرتے ہیں۔ اسی انحطاطی ذہنیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن قوم فرعون کے بیان کے سلسلہ میں کہتا ہے:

قَالُوْآ اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَ نَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ (۱۰:۷۸)

انھوں نے کہا کیا تو اس لیے آیا ہے کہ ہمیں اس راستہ سے پھیر دے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا تھا اور تم دونوں کے لیے زمین پر بڑائی ہو اور ہم تم دونوں کو کبھی ماننے والے نہیں۔

ایک اور جگہ اسی طرز فکر کا حوالہ دیتے ہوئے قرآن کہتا ہے:

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَ نَا (۵:۱۰۴)

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو کچھ اتارا ہے اس کی طرف اور رسول اللہ کی طرف آؤ تو وہ کہتے ہیں کہ جو کچھ ہمارے باپ دادا نے ہمارے لیے چھوڑا ہے وہ ہمارے لیے کافی ہے۔

ان آیات کے علاوہ قرآن کی اور بے شمار آیات میں بھی تباہ ہونے والی قوموں کی تقلیدی روش کا خصوصیت سے ذکر کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ زوال پذیر قوموں میں اتنی ذہنی اپج باقی نہیں رہتی کہ وہ زندگی کا کوئی نیا راستہ اختیار کر سکیں یا اپنے طور طریقوں میں کوئی مفید تبدیلی پیدا کر سکیں بلکہ جو بنا بنایا راستہ یا لگے بندھے طریقے ان کو اپنے آباؤ اجداد سے ورثہ میں ملتے ہیں انھیں پر آنکھیں بند کر کے چلتی رہتی ہیں۔ قرآن نے تو صرف آباؤ اجداد کی تقلید کا ذکر کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب کسی قوم میں تقلید کا مرض پیدا ہو جاتا ہے تو وہ صرف آباؤ اجداد کے طریقوں تک محدود نہیں رہتا بلکہ ایک سے زاید صورتیں اختیار کرتا ہے۔ مثلاً ہمارے مغرب زدہ طبقہ میں انگریز بننے کا جو شوق ہے وہ بنیادی حقیقت کے اعتبار سے ان لوگوں کی روش سے مختلف نہیں جو اسلاف کے طور طریقوں کو حرف آخر

سمجھتے ہیں ۔ ان دونوں طبقوں میں ذہنی اور تعمیری اپج بالکل فنا ہوگئی ہے، اس لیے ایک آنکھیں بند کر کے آباؤاجداد کے طریقوں پر عمل کرتا ہے اور دوسرا اس طرز فکر اور طرز حیات کی تقلید میں گرفتار ہے جو اسے انگریز آقاؤں سے ملا ہے۔ دونوں کے اندر اتنی صداقت فکر اور قوت تخیل موجود نہیں کہ وہ ان بنے بنائے طریقوں میں سے کسی اصول کے مطابق اچھی باتیں اخذ کر کے بری باتیں ترک کر دے۔ کیوں کہ اس کے لیے ایک اعلیٰ درجہ کی انتخابی نگاہ اور تنقیدی فکر درکار ہے جو کھرے کھوٹے اور اچھے برے میں تمیز کر سکے۔ ترکی میں مصطفیٰ کمال پاشا نے جس معاشرتی انقلاب کی بنیاد ڈالی اس میں بھی یہی تقلیدی جذبہ کارفرما تھا۔ ترکی کا کمالی انقلاب کوئی تعمیری یا تخلیقی انقلاب نہ تھا بلکہ ایک تقلیدی انقلاب تھا۔ کمالی پارٹی کے ارکان اور ان کے دشمن یعنی پرانے طرز کے علما ذہنی اعتبار سے ایک ہی سطح کے لوگ تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ مصطفیٰ کمال اور اس کی پارٹی یورپ کی تقلید کرنا چاہتی تھی اور ملاؤں کا طبقہ اپنے اسلاف کے پرانے طریقوں پر چلنا چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مصطفیٰ کمال کی حکومت نے اسلام کے بنیادی اصولوں سے نئے حالات کے مطابق ایک جدید اسلامی نظام قانون مرتب کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی بلکہ فرانس اور سویٹزرلینڈ کے قوانین کو من و عن لے کر ترکی میں رائج کر دیا۔ اسی تقلیدی روش کے نتیجہ میں ترکوں کو قوم پرستانہ طرز فکر کی تعلیم دے کر انھیں اسلام کی عالم گیر برداری سے توڑ لیا گیا۔ اتنے طویل عرصہ کے بعد بھی ترکی کی بین الاقوامی پوزیشن میں کوئی خاص فرق نہ ہونے اور اس ملک پر مغربی ممالک کی بالادستی قائم رہنے کا سبب یہی ہے کہ ترکوں نے اجتہاد کے بجائے تقلید کی روش اختیار کی۔

زوال پذیر قوموں کے اس جذبہ تقلید کا بنیادی سبب اگر تلاش کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ ذہنی انحطاط دراصل مادی اقدار کی پرستش سے پیدا ہوتا ہے۔ جو قومیں زندگی کی ادنیٰ لذات عیش و راحت، اسباب زینت اور سامان آرائش پر جان دیتی ہیں اور انھیں چیزوں کے حصول کو اپنا مطمح نظر بنا لیتی ہیں ان کے اندر جزوی امور کو سمجھنے کی صلاحیت تو ضرور ترقی کر جاتی ہے لیکن عمومی قوانین اور مجرد تصورات کے فہم و ادراک کی قابلیت باقی نہیں رہتی۔

کیوں کہ مادی زندگی کی آرائش وزیبائش اور کام ودہن کی لذت حاصل کرنے میں انھیں اپنی عقل جزوی کو قدم قدم پر استعمال کرنا پڑتا ہے۔ لیکن ان ادنیٰ مقاصد کے تکمیل کے لیے عقل کلی کی امداد اور وساطت ضروری نہیں ہوتی۔ حالانکہ انسانی زندگی کے بنیادی قوانین خواہ ان کا تعلق سائنس سے ہو یا تاریخ سے ہو یا مذہب واخلاق سے صرف اس عقل کی مدد سے جانے بوجھے جاسکتے ہیں جو جزویات کے تجربہ سے کلیات تک پہنچ سکے اور تفصیلی مشاہدات سے عمومی قوانین مستنبط کر سکے۔ جو عقل صرف جزویات وتفصیلات میں الجھ کر رہ جائے وہ حیات کے بنیادی قوانین اور سائنس کے اصول وکلیات تک کیسے رسائی حاصل کرسکتی ہے۔

کفار اور مشرکین کو عقیدہ توحید سے جو انکار تھا اس کی حقیقی وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ مادی زندگی کی ادنیٰ دلچسپیوں میں اتنے منہمک اور وارفتہ تھے کہ ان کا ذہن ٹھوس مادی حقائق کے علاوہ اعلیٰ تر مجرد تصورات اور عمومی قوانین کا ادراک کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اس لیے یہ لوگ عقیدہ توحید کو سمجھنے سے قاصر تھے جو ہمیں اس امر کی تعلیم دیتا ہے کہ کائنات کے مختلف شعبوں میں جو واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں، خواہ ان کی ظاہری شکلیں کتنی ہی مختلف ہوں اصل میں ایک واحد قانون کے منبع سے صادر ہوتے ہیں۔ یہی صفت ہر اس قوم میں پیدا ہو جاتی ہے خواہ وہ توحید کی زبانی دعوے دار ہی کیوں نہ ہو جس کا تصور حیات اتنا پست ہو کہ اس کے افراد کھانے پینے، سیر وتفریح اور اسی قسم کے دیگر مادی مسائل کے علاوہ کسی روحانی، اخلاقی یا ذہنی مسئلہ سے دلچسپی نہ رکھتے ہوں۔ انسان کی تقلیدی روش خواہ وہ آباؤاجداد کی تقلید ہو یا گردوپیش کی ترقی یافتہ قوموں کی تقلید ہو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ زندگی کے بلند حقائق اور مقاصد سے غافل ہو کر اس نے حیات دنیوی کی ادنیٰ لذتوں اور مسرتوں کے حصول کو اپنا واحد مطمح نظر بنالیا ہے۔ اس لیے وہ اپنے مشاہدات وتجربات کے سطحی اور ظاہری معنوں کے سوا ان کے حقیقی اسرار اور پنہاں مطالب تک پہنچنے کی زحمت نہیں گوارا کرتا۔ چنانچہ ہمارے ملاؤں اور مغرب زدہ طبقوں کی زندگی سے اس حقیقت کی تصدیق ہوتی ہے کیوں کہ ان لوگوں کو سیر وتفریح، کھانے پینے اور دیگر نفسانی لذتوں کے سوا اور کسی چیز سے

دلچسپی باقی نہیں رہی ہے۔نتیجہ یہ ہے کہ ان میں فکر کی گہرائی اور عقل کی صحیح بصیرت مفقود ہوتی جارہی ہے۔البتہ یہ لوگ روزمرہ کے معاملات اور معمولی باتوں میں جو ان کے ذاتی مفاد سے تعلق رکھتی ہیں بڑے ہوشیار ہوتے ہیں۔ جو بنے بنائے طریقے انھوں نے اپنے آباؤاجداد یا اپنے غیر ملکی حکمرانوں سے ورثہ میں پائے ہیں، ان پر اندھے پن سے چلتے رہنے کو یہ لوگ بڑی کامیابی خیال کرتے ہیں۔ جب ان طریقوں میں تبدیلی پیدا کرنے کا مطالبہ ان کے سامنے پیش کیا جاتا ہے تو ملاؤں کا طبقہ یہ کہہ کر اس مطالبہ کو رد کر دیتا ہے کہ تم کافر اور دہریہ ہو اور دوسرا طبقہ فوراً انگریزوں اور امریکہ کے باشندوں کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہے کہ دیکھتے نہیں یہ دونوں قومیں کتنی ترقی یافتہ اور خوش حال ہیں اس لیے ان کا طرز فکر اور طریق حیات کیسے غلط ہوسکتا ہے۔ان بیچاروں کو ابھی تک یہ احساس نہیں کہ جن قوموں کی یہ تقلید کر رہے ہیں وہ نہایت تیزی کے ساتھ فنا و ہلاکت کی طرف بڑھتی جارہی ہیں اور ان کی مصنوعی اور بے روح تہذیب اپنی شکست کے اسباب اپنے ہاتھوں خود جمع کر رہی ہے:

تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خود کشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

تقلیدی رجحانات کے علاوہ زوال پذیر قوموں اور طبقوں کی ایک اور خصوصیت قرآن نے یہ بیان کی ہے کہ وہ ظالم اور بدکردار لوگوں کی حکومت کو بغیر کسی مزاحمت اور احتجاج کے خوشی خوشی برداشت کر لیتے ہیں۔ چنانچہ قوم عاد کے متعلق قرآن فرماتا ہے:

وَتِلْكَ عَادٌ جَحَدُوا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهٗ وَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ (۵۹:۱۱)

یہ عاد تھے جنھوں نے اپنے رب کی نشانیوں کا انکار کیا اور ہر ایک ظالم اور نافرمان حکمران کے احکام کی بے چون و چرا اطاعت کرتے رہے۔

اس بات کو قرآن نے ایک اور جگہ یوں بیان کیا ہے:

اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِیْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَ تَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ٥
وَقَالَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا (۲:۱۶۶،۱۶۷)

جب لیڈر اپنے پیروؤں سے بیزاری ظاہر کریں گے اور عذاب کو دیکھیں گے اور ان کے تعلقات کٹ جائیں گے اور ان کے پیرو کہنے لگیں گے کہ کاش ہمیں دنیا میں پھر واپس جانا ہوتا تو ہم ان سے اسی طرح بیزار ہوتے جس طرح آج وہ ہم سے بیزار ہیں۔

آخری آیت میں قرآن نے روز قیامت کا نقشہ کھینچا ہے کہ اس دن وہ تمام لیڈر جنھوں نے اپنی اپنی قوم کو گمراہ کیا تھا اپنے ماننے والوں کے اعمال سے خود کو بری الذمہ قرار دیں گے۔ اس پر ان لیڈروں کے ماننے والے اور ان کے پیچھے چلنے والے کہیں گے کہ اگر ہمارے لیے دنیا میں واپس جانا ممکن ہوتا تو ہم بھی ان لیڈروں کی رہنمائی قبول کرنے سے انکار کر دیتے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ابتدا میں تو عوام الناس بغیر کسی مزاحمت اور مخالفت کے ظالم اور بدکردار لیڈروں کی قیادت کو برداشت کر لیتے ہیں لیکن جب ان کی غلط رہنمائی سے سوسائٹی میں ظلم وفساد اور تعیش پرورش پانے لگتے ہیں اور انجام کار تاریخ اس پوری قوم سے اس کی غفلتوں اور عیش پرستیوں کا انتقام لینا شروع کرتی ہے، تب عام لوگوں کو یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم نے ان لیڈروں کی اطاعت کرنے میں بڑی سخت غلطی کی۔ کاش کہ قدرت ہمیں پھر ایک بار موقع دیتی تو ہم اچھے لیڈروں کا انتخاب کرتے لیکن چوں کہ تاریخ کے انتقامی عدل کا آغاز ہونے کے بعد پھر اس کے تجربات کا موقع باقی نہیں رہتا، اس لیے ان کی یہ آرزو رائیگاں جاتی ہے اور ساری قوم جن میں اچھے بُرے سبھی شامل ہوتے ہیں اس عذاب تاریخ کی نذر ہو کر اجتماعی حیثیت سے پارہ پارہ ہو جاتی ہے، قومیں اپنے لیڈروں اور حکمرانوں کے عزل ونصب میں اس قسم کی غلطیوں کا ارتکاب کیوں کرتی ہیں اس کی وجہ پر اگر غور کیا جائے معلوم ہوگا کہ تملکی جذبات کا غلبہ اور تخلیق وتعمیر کے جوش کی کمی اس گناہ کا اصلی سبب ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ جب تک قوم پر راست کردار لوگوں کا اثر قائم رہتا ہے۔ وہ تعلیم و تربیت کے نظام اور پروپیگنڈے کے وسائل سے قوم میں تخلیقی جذبات اور تعمیری امنگوں کی

حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور ایسے میلانات و جذبات کو سختی سے دبا دیتے ہیں جن سے تعیش، آرام پسندی، نفس پرستی اور دولت و ثروت کی ہوس کے بڑھنے کا اندیشہ ہو۔ لیکن جب قوم کی لیڈر شپ غلط اشخاص کے ہاتھ میں آ جاتی ہے تو اس کی دیکھا دیکھی ساری قوم نفس پرستی، تعیش اور دولت کی ہوس میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ جس سے قوم میں اتحاد کی جگہ اختلاف و انتشار پیدا ہونے لگتا ہے اور لوگ تعمیری کاموں کے بجائے اپنی ذاتی بڑائی اور ترقی کے لیے طرح طرح کی بداخلاقیوں کا ارتکاب کرنے لگتے ہیں۔ ساری جتھے بندیاں اور پارٹی بندیاں اس اساس و بنیاد پر وجود میں آتی ہیں کہ فلاں فلاں گروہ اور فلاں فلاں خاندان کی بجائے ملک کا سیاسی اقتدار اور اس کے معاشی وسائل ہمارے ہاتھ آئیں۔

اس کشمکش اقتدار اور جنگ زرگری کے باعث جب اجتماعی حالات خراب سے خراب تر ہو جاتے ہیں اور عوام اور متوسط طبقات کو بھی ان خرابیوں کا احساس ہونے لگتا ہے تو قوم کے حساس اور باعمل افراد میدان میں آنا چاہتے ہیں تاکہ اس کی اصلاح و تعمیر کا کام انجام دیں۔ لیکن چونکہ اس قسم کی اصلاحی اور تعمیری جدوجہد کے لیے ایثار کی ضرورت ہوتی ہے، قید و بند کی سختیاں جھیلنی پڑتی ہیں بلکہ اپنے مقصد کے لیے جان بھی دینی پڑتی ہے، اس لیے زوال پذیر قوموں میں اکثر و بیشتر اصلاح احوال اور تعمیر معاشرت کی کوششیں ناکام ہو جاتی ہیں کیوں کہ قوم کی بہت بڑی اکثریت راحت پسندی، لذت طلبی اور عیش میں مبتلا ہونے کی وجہ سے مصلحون کا ساتھ نہیں دیتی۔ جس ملک میں دولت کو واحد معیار عزت تسلیم کیا جاتا ہو جس میں اعلیٰ تعمیری مقاصد اور اجتماعی اغراض کے لیے مالی ایثار اور جانی قربانیاں کرنے کی صلاحیت مفقود ہو گئی ہو، اس میں چند حساس اور باشعور افراد کی آواز صدا بہ صحرا ثابت ہوتی ہے کیوں کہ اگر دو چار افراد میدان میں آ کر معاشرہ کی خرابیوں کو دور کرنے کی کوشش کریں، اور ملک کی عام آبادی ان کا ساتھ نہ دے تو ان کی جدوجہد اور قربانیوں کا کوئی فائدہ نہ ہو گا لیکن عام افراد قوم ان اصلاح پسندوں اور تعمیری ذوق رکھنے والے اشخاص کا ساتھ کیسے دے سکتے ہیں جب کہ وہ مادی اقدار و لذات کی پرستش میں مبتلا ہو کر مجاہدانہ سرفروشی کے جذبہ سے خالی ہو چکے

ہوں۔ یہ ظاہر ہے کہ اگر قوم کی بہت بڑی اکثریت زندگی کی حقیر لذتوں اور مسرتوں کے پیچھے دیوانی ہو، اور اس میں کسی حیات برتر کا تصور نہ باقی ہو تو اس قسم کی اصلاحی اور تعمیری جدوجہد میں جو انسان سے ایثار نفس، جفاکشی اور مالی قربانیوں کا مطالبہ کرے بہت کم لوگ حصہ لینے کے لیے آمادہ ہوں گے۔ اس لیے اکثر اوقات ہوتا یہ ہے کہ جو لوگ اپنے ملک وقوم کے حالات سے بددل اور غیر مطمئن ہو کر اخلاص اور سچائی کے ساتھ اصلاح حال کی کوشش کرنا چاہتے ہیں۔ وہ قوم کی لذت پرستی، عیش طلبی اور غفلت شعاری کے باعث بے بس اور مجبور ہو جاتے ہیں۔ اور جو لوگ ملک وقوم کی اخلاقی خرابیوں کے واقعتاً ذمہ دار ہیں وہ بغیر کسی رکاوٹ، مزاحمت یا احتجاج کے اپنی تخریبی کارروائیوں میں مصروف رہتے ہیں۔ اس صورت حال کا آخری انجام وہی ہوتا ہے جس کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے یعنی بالآخر قانون مکافات عمل کے ناگزیر نتائج سامنے آنے لگتے ہیں اور تاریخ کا دست انتقام اپنا وار شروع کر دیتا ہے۔ اس وقت لوگوں کو احساس ہوتا ہے کہ ہم نے غلط لیڈروں کی اطاعت کر کے اور خوشنما مذہبی نعروں سے متاثر ہو کر اپنے آپ کو اس اجتماعی آفت میں مبتلا کیا۔ کاش کہ ہمیں پھر ایک بار موقع دیا جاتا، لیکن قدرت کا وقت موعودہ آ جانے کے بعد پھر ٹل نہیں سکتا۔ اس لیے پوری قوم شکست وادبار میں مبتلا ہو کر اجتماعی حیثیت سے پارہ پارہ ہو جاتی ہے۔

البتہ بعض وقت ایسا بھی ہوتا ہے کہ چند حساس اور مخلص انسان مل کر پوری قوت اور جدوجہد سے قوم کے باشعور اور سمجھدار افراد کی تائید وحمایت کے ساتھ اپنی اصلاحی تحریک پھیلاتے رہتے ہیں اور مالدار طبقوں کے تمام مظالم اور سختیوں کو صبر کے ساتھ برداشت کرتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ انھیں بالآخر اپنے مخالفین پر فتح حاصل ہوتی ہے۔ اسی قلیل التعداد گروہ کے متعلق جس کے کردار عمل کو دیکھ کر قوم اس کے اخلاص اور سچائی پر اعتماد کرنے لگتی ہے۔ قرآن فرماتا ہے:

كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِينَ (۲:۲۴۹)

ترجمہ: اور کتنی ہی قلیل التعداد اور مختصر جماعتیں ہیں جو اللہ کی مدد سے بڑی بڑی کثیر التعداد

جماعتوں پر غالب آجاتی ہیں کیونکہ اللہ انھیں کا ساتھ دیتا ہے جو اپنے مقصد اور نصب العین کے لیے ہر قسم کی تکلیفیں اور مصیبتیں برداشت کرلیں۔

یعنی یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اگر کسی اصلاحی گروہ کی تعداد اور معاشی طاقت کم ہے تو وہ لازماً اس کشمکش میں ناکام ہی ہوگا جو وہ ظالموں اور عیش پرستوں کے خلاف برپا کرتا ہے۔ اس کے برعکس اگر وہ واقعتاً قوم کا مخلص اور حق وصداقت پر قائم ہو اور اپنی جدوجہد سے ثابت کردے کہ وہ کسی خاص طبقہ کے مفاد کی خاطر میدان عمل میں نہیں آیا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی جدوجہد کو ضرور کامیاب کرتا ہے۔ چنانچہ تاریخ میں جتنے انقلابات ہوئے ہیں ان کے برپا کرنے والوں کی تعداد ہمیشہ قلیل ہی تھی۔ لیکن وہ اپنے ملک یا انسانیت کے سچے بہی خواہ تھے اور جس مقصد کو انھوں نے اختیار کیا اس کے لیے کوئی ایثار، کوئی قربانی اور کوئی تکلیف ایسی نہ تھی جس کو انھوں نے خوشی خوشی نہ برداشت کیا ہو۔ قرآن نے حضرت موسیٰ اور فرعون کی کشمکش کے سلسلہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے ایک کامیاب اور فتح مند اصلاحی گروہ اور ایک انحطاط پذیر اور مائل بہ شکست حکمران طبقہ کی جو اخلاقی حالت اور صفات بیان کی ہیں، ان کا اطلاق تاریخ کے ہر بڑے انقلاب پر کیا جاسکتا ہے، چنانچہ قرآن ارشاد فرماتا ہے:

وَقَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ أَتَذَرُ مُوسَىٰ وَقَوْمَهُ لِيُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَيَذَرَكَ وَآلِهَتَكَ قَالَ سَنُقَتِّلُ أَبْنَاءَهُمْ وَنَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ وَإِنَّا فَوْقَهُمْ قَاهِرُونَ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ اسْتَعِينُوا بِاللَّهِ وَاصْبِرُوا إِنَّ الْأَرْضَ لِلَّهِ يُورِثُهَا مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ قَالُوا أُوذِينَا مِنْ قَبْلِ أَنْ تَأْتِيَنَا وَمِنْ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا قَالَ عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَنْ يُهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ (۷: ۱۲۷-۱۲۹)

فرعون کے اُمرا اور درباریوں نے کہا کیا تو موسیٰ اور اس کی قوم کو یوں ہی چھوڑ دے گا تا کہ وہ زمین پر فساد مچائیں اور تجھے اور تیرے معبودوں کو چھوڑ دیں۔ موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ سے مدد مانگو اور اپنے مقصد کے لیے صبر وتحمل سے تکالیف برداشت کرو۔ زمین تو اللہ کی ہے وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے، اس کا وارث بنا دیتا ہے اور انجام کار تو

بالآخران ہی لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو مکافات عمل سے خوف کھاتے ہیں۔انھوں نے کہا
موسیٰ تمھارے آنے سے پہلے بھی ہمیں تکلیفیں دی گئیں اور تمھارے آنے کے بعد بھی،
موسیٰ نے کہا کہ تمارا رب عنقریب تمھارے دشمن کو ہلاک کرنے والا ہے اور اس کی جگہ تمھیں
زمین کی خلافت عطا کرے گا تاکہ وہ دیکھ سکے کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔

یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام یعنی ایک اصلاحی گروہ کے لیڈر کو فرعون اور اس کے امرا نے بانی فساد قرار دیا ہے حالانکہ دراصل فساد کے بانی وہ خود تھے۔ یہ الزام تاریخ کی ہر اجتماعی جدوجہد کے رہنماؤں پر ظالم سلطنتوں کی طرف سے وارد کیا جاتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ایک غلط اور ظالمانہ نظام کو شکست دے کر یا کسی ظالم قوم کی محکومی سے آزادی حاصل کر کے ایک صحیح طرز کا معاشرہ یا ایک آزاد قومی حکومت قائم کرنے میں جو درمیانی عرصہ گزرتا ہے اس میں تھوڑی سی بدنظمی اور خون ریزی ضرور ہوتی ہے۔

حصہ دوم

رومی تہذیب

رومی سلطنت مسلمانوں سے پہلے دنیا کی عظیم ترین سلطنت تھی۔قدیم رومی جنھوں نے چند منتشر آبادیوں سے ترقی کر کے پہلے اطالیہ میں ایک خود مختار ریاست قائم کی اور پھر ساری مہذب دنیا کے لیڈر بن گئے اپنی جفاکشی، محنت جنگجوئی، سادہ عادات اور جمہوری روایات کے باعث ہمعصر قوموں میں ممتاز تھے۔ جب انھوں نے کشور کشائی اور ملک گیری کا پہلا قدم اٹھایا تو وہ معاشی حیثیت سے کمزور لیکن جان فروشی، شجاعت اور حب الوطنی میں قوی تھے۔ان میں دنیوی شان وشوکت اور ظاہری آرائش وزیبائش کی کوئی علامات نہیں پائی جاتی تھیں۔

اس کے برعکس ان کی زندگی نہایت سادہ اوران کی سوسائٹی عدم مساوات سے پاک تھی۔ ان میں غریب بھی تھے اور امیر بھی لیکن دونوں ایک دوسرے کے حقوق کو تسلیم کرتے تھے۔ رومیوں کی سب سے زیادہ ممتاز خصوصیت یہ تھی کہ انھوں نے شہنشاہیت اور ملوکیت کا خاتمہ کر کے اپنے ملک میں ایک سادہ جمہوری نظام قائم کیا جس میں عوام کی آزادی اور حقوق کا پورا پورا تحفظ موجود تھا۔اس عظیم الشان قوم کو زوال وانحطاط نے کیوں کر آلیا اور انہوں نے رفتہ رفتہ اپنی سادگی، محنت، جفاکشی اور حب الوطنی کی خصوصیات کس طرح کھودیں اس کا حال ہمیں گبن کی مشہور کتاب زوال سلطنت روما سے معلوم ہوتا ہے۔ہم رومیوں کے دور زوال کی خصوصیات پر بحث کرنے کے لیے اس مشہور تاریخ سے حسب ذیل اقتباسات پیش کرتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ قوموں کے زوال وانحطاط میں کن اسباب وعوامل کو دخل ہوا کرتا ہے۔

آغسطس کا آمرانہ طرز حکومت

آغسطس سنات کے وقار واحترام کو ازسرنو قائم کیا لیکن اس کے اثر اور اس کی خود مختاری

کو بالکل مٹا دیا۔ اس کے دور حکومت کے آغاز سے سنات رومی سلطنت کے حاکم اعلیٰ کی ایک نامزد کردہ جماعت بن گئی اور ایک خود مختار اور با اقتدار جماعت کی حیثیت سے اس کا خاتمہ ہو گیا۔

آغسطس کی خدمت کے صلہ میں سنات نے اس کو پوری سلطنت روما کا مالک اور مطلق العنان حکمران بنانا منظور کیا اور اس کی یہ تجویز مان لی کہ زمانہ امن میں بھی رومی فوجوں کی کمان اسی کے ہاتھ میں رہے۔ اس طرح آغسطس نے فوجی قوت اپنے ہاتھ میں لے کر روما کو ایک مطلق العنان آمریت بنا دیا۔ اگرچہ آغسطس فوجی طاقت کو اپنی سلطنت کا محفوظ ترین سہارا خیال کرتا تھا لیکن یہ ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا کہ اس کی حکومت فوج پر موقوف ہے۔ چنانچہ اس نے قدیم زمانہ کی جمہوری اصطلاحات اور جمہوری عہدوں کو قائم رکھنا مناسب خیال کیا اور خود ایک اعلیٰ ترین مجسٹریٹ کی حیثیت اختیار کی۔ اس غرض سے اس نے سنات کو اجازت دی کہ وہ اسے قونصل اور ٹرائیبیون دونوں کے جذبات و اختیارات تفویض کرے۔ قونصل قدیم رومی جمہوریت کے اعلیٰ ترین عہدہ دار ہوتے تھے۔ جنھیں روم کے بادشاہوں کی جگہ مقرر کیا گیا تھا۔ عوام ان کو ایک سال کی مدت کے لیے منتخب کرتے تھے۔ لیکن تعداد میں یہ ایک کے بجائے دو ہوتے تھے۔ تاکہ ان میں سے کوئی بھی زیادہ طاقت ور نہ بن سکے۔ اس طرح آغسطس نے قونصل اور ٹریبیون کے اختیارات حاصل کر لیے پھر جب عاملہ کے تمام اختیارت اس شاہی مجسٹریٹ کو حاصل ہو گئے تو سلطنت کے معمولی مجسٹریٹ بالکل گمنام، بے اختیار اور بے کار ہو گئے لیکن آغسطس نے بڑی ہوشیاری سے قدیم جمہوریت کے ظاہری اشکال قائم رکھے چنانچہ جمہوری دور میں جتنے قونصل، پریٹز اور ٹرائیبیون ہوتے تھے۔ آغسطس بھی اسی تعداد میں ان عہدوں پر تقررات کیا کرتا تھا۔

مختصر الفاظ میں رومی سلطنت اب ایک شہنشاہیت میں تبدیل ہو گئی جس پر جمہوری اصطلاحات و اشکال کا خوشنما پردہ ڈال دیا گیا تھا۔ روما کے یہ شہنشاہی آقا اپنے آمرانہ اختیارات اور مطلق العنان اقتدار کو عوام کی نظروں سے پوشیدہ رکھنا اور یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ وہ سنات کے آگے ذمہ دار ہیں حالانکہ سنات درحقیقت انھیں کی مٹھی میں تھی۔

آغسطس اپنے چچا سیزر کے قتل کا منظر دیکھ چکا تھا۔ سیزر نے اپنے حامیوں پر زرو جواہر اور انعامات و اکرامات کی بارش کر دی تھی۔ لیکن اس کے بعض نہایت عزیز دوست اس سازش میں شریک تھے جو اس کے قتل پر منتج ہوئی۔ فوجوں کی وفاداری اور قاتلانہ حملوں کے خلاف اس کے پاس کوئی ہتھیار نہ تھا۔ رومی عوام کے دلوں میں ابھی بروٹس کی یاد تازہ تھی اور ابھی تک اس کی پیروی اور تقلید کرنے والوں کو عوام حسن عقیدت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ سیزر کا جو انجام ہوا تھا، اس کی صرف یہی وجہ تھی کہ وہ مطلق العنان حکمران بن بیٹھا تھا بلکہ اس کا اصلی سبب یہ تھا کہ وہ اپنی مطلق العنانی کا علانیہ مظاہرہ کرتا تھا۔ آغسطس سمجھ دار تھا۔ وہ جانتا تھا کہ دنیا والے ظاہری اصطلاحات اور خارجی رسوم وشعائر پر جان دیتے ہیں۔ اس کی یہ توقع غلط نہ تھی کہ رومی سنات اور عوام غلامی کا جوا اُٹھانے پر تیار ہو جائیں گے۔ بشرطیکہ انھیں اس دھوکا میں رکھا جائے کہ ان کی قدیم آزادی قائم ہے۔ چنانچہ ایک کمزور سنات اور دلدادۂ عیش قوم اس فریب میں اس وقت تک مبتلا رہی جب تک آغسطس اور اس کے جانشین اعتدال اور میانہ روی سے کام لیتے رہے۔ کیلی گولا نیرو اور ڈومیشین پر جو قاتلانہ حملے ہوئے ان کا محرک یہ خیال نہ تھا کہ روما کی قدیم جمہوریت کا احیا کیا جائے بلکہ قاتلوں نے اپنے ذاتی تحفظ کی خاطر یہ خطرناک قدم اٹھایا۔ ان کا حملہ ظالم بادشاہوں کی ذات پر تھا نہ کہ ان کے غیر جمہوری اور ظالمانہ طرز حکومت پر۔

روما کی تاریخ میں ایک وقت ایسا ضرور آیا جب کہ سنات نے ستر سال کے صبر وتحمل کے بعد اپنے حقوق واختیارات واپس لینے کی ایک ناکام کوشش کی۔ کیلی گولا کے قتل کے بعد جب تخت شاہی خالی ہو گیا تو قونصلوں نے سنات کا جلسہ طلب کر کے سابق حکمرانوں کے طرز حکومت کی مذمت کی اور اڑتالیس گھنٹوں تک ایک آزاد اور جمہوری سلطنت کے خادموں کی حیثیت سے حکومت کا کام انجام دیا۔ لیکن ادھر وہ اپنے مشوروں اور عزائم میں مصروف تھے ادھر پریلیوری محافظ دستوں نے کلاڈیس کو شہنشاہ بنا کر اس کی حکومت کا اعلان کر دیا۔ اس طرح سنات کا خواب آزادی شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا اور اسی نے چاروناچار نئے

شہنشاہ کی غلامی کا جوا قبول کر لیا۔عوام نے سنات کی حمایت میں ایک آواز بھی نہیں اٹھائی اور فوج نے اسے تشدد کی دھمکی دی۔ان حالات میں سنات کو پریطوری محافظ دستوں کے انتخاب کی توثیق کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہا۔

فوجیوں کی خودسری

گالبا، آتھور اور وٹیلیس تینوں شہنشاہوں کے انجام نے فوجیوں کے دل میں یہ یقین پیدا کر دیا کہ شہنشاہوں کا عزل ونصب ان کے ہاتھ میں ہے۔

ملکی سیاسیات پر نسوانی اثرات

اپنے آخری ایام میں آغسطس نے اپنی مرضی کے خلاف اور محض اپنی بیوی لیویا کو خوش کرنے کے لیے ٹائیبر لیس کلاڈیس کو جو اس کے پہلے شوہر کا بیٹا تھا اپنا جانشین نامزد کیا ٹابیر لیس کے بعد کیلی گولا تخت شاہی کا مالک بنا اور کیلی گولا کی موت پر اس کا چچا کلاڈیس تخت نشین ہوا۔یہ شہنشاہ اپنی بیویوں مسالینا اور اگرپینا کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی کی طرح ناچتا رہا۔چنانچہ اگرپینا نے اپنے پہلے شوہر کے بیٹے نیرو کو تخت نشین کرانے کے لیے کلاڈیس کو زہر دے دیا۔

فاسٹینا جو مارکس آریلیس کی بیوی تھی اپنی عشق بازی کے لیے بھی اتنی ہی مشہور تھی جتنی اپنے حسن کے لیے۔مارکس ہی سلطنت میں اکیلا فرد تھا جو یا تو اپنی بیوی کی حرکتوں سے ناواقف تھا یا دیدہ دانستہ اس سے چشم پوشی کرتا تھا۔تیس سال کے دور حکومت میں اس نے فاسٹینا کے کئی ایک عاشقوں کو بڑے بڑے عہدوں پر ترقی دی بلکہ بیوی کی وفات کے بعد بھی وہ اس کی محبت میں گرفتار رہا۔چنانچہ اس نے سنات سے خواہش کی کہ وہ فاسٹینا کو مرتبہ الوہیت سے سرفراز کرے۔سنات نے جو حسب سابق خوشامدیوں کی ایک جماعت تھی اس کی یہ خواہش پوری کر دی اور فاسٹینا کو دیویوں کے زمرہ میں شامل کر دینے کا اعلان کیا۔

کموڈس کے زمانہ یعنی ۱۸۹ء میں روم میں قحط اور بیماریوں کا ایک بڑا حملہ ہوا۔بیماری کے متعلق تو عام خیال یہ تھا کہ یہ خدا کے غیظ وغضب کی نشانی ہے لیکن قحط کے بارے میں

لوگوں کو معلوم تھا کہ یہ شہنشاہ کے دست راست کلینڈر کے غیر معمولی اقتدار، دولت وثروت نیز اس اجارہ داری کا نتیجہ ہے جو غلہ کی خرید وفروخت کے متعلق چند بڑے بڑے تاجروں کو حاصل ہوگئی ہے۔ عوام نے جو سرکس میں تفریح اور عیش ونشاط کی غرض سے جمع ہوئے تھے غیظ وغضب میں آ کر شاہی محل کو گھیر لیا۔ اور جب کلینڈر نے فوج کو ان کا مقابلہ کرنے کے لیے حکم دیا تو پیدل فوج جو سواروں کے مخصوص حقوق ومراعات کے مدنظر اپنی کس مپرسی سے نالاں تھی عوام کے ساتھ مل گئی۔ اب عوام نے اپنی طاقت محسوس کر کے کلینڈر کو قتل کر دینے کا مطالبہ کیا لیکن یہ خبر کموڈس تک کون پہنچاتا۔ بالآخر فیڈیلا اور مارشیا نے جو اس کی دو چہیتی داشتہ عورتیں تھیں، شہنشاہ کو اس صورت حال کی خبر کی۔ کموڈس نے خیریت اسی میں دیکھی کہ اپنے دست راست کلینڈر کو عوام کے مطالبہ پر قربان کر دے۔ چنانچہ اس نے حکم دیا کہ کلینڈر کو قتل کر کے اس کا سر شاہی محل کے باہر پھینک دیا جائے۔

کموڈس کی خانگی زندگی کے متعلق گبن لکھتا ہے کہ وہ تین سو حسین عورتوں اور نوجوان لڑکوں کی صحبت میں رہتا تھا۔ اس کی ناشائستہ حرکات جن کا قدیم مورخوں نے تفصیل کے ساتھ نقشہ کھینچا ہے مہذب قوموں کی زبان میں بیان نہیں کی جاسکتیں۔ کموڈس کو علم وفضل، شعر وشاعری غرضیکہ ہر سنجیدہ اور شائستہ چیز سے نفرت تھی۔ سرکس کے کھیل، پیشہ ور تیغ زنوں کے مظاہرے، تھیٹر کے تماشے اور جنگلی جانوروں کا شکار اس کے محبوب مشاغل تھے۔ اس کے ساتھیوں اور ہم نشینوں میں ان علما اور فضلا کی کھلم کھلا ہنسی اڑائی جاتی تھی، جنھیں مارکس نے اس کی تعلیم وتربیت پر مامور کیا تھا۔ پہلوانوں، شکاریوں اور دوسرے تفریحی مشاغل کے پیشہ ور ماہرین کی بڑی قدر ومنزلت تھی۔ عوام اور متوسط طبقات جن کے وسائل معاش شہنشاہ کے ہاتھ میں تھے اس کی ناشائستہ زندگی کی تعریف میں رطب اللسان تھے اور اسے یہ یقین دلانے کی کوشش کرتے تھے کہ اپنی خوبیوں اور کمالات کی وجہ سے وہ دیوتاؤں میں شمار کیے جانے کے لائق ہے۔ بالآخر اس کی ظالمانہ کارروائیوں اور انتقامی جذبہ نے خود اس کی محبوبہ مارشیا اور پریطوری سردار لیٹس کے دل میں یہ اندیشہ پیدا کر دیا کہ کہیں وہ بھی اس کے

غیظ و غضب اور بے اصولی کا شکار نہ بن جائیں۔ اس خوف سے مارشیا نے کموڈس کو زہر دے کر ہلاک کر دیا۔

اصلاحی کوششوں کی ناکامی

کموڈس کے بعد فوجیوں کی نگاہ انتخاب پرٹناکس پر پڑی جو سنات کا ایک قدیم رکن تھا۔ پرٹناکس کے انکار کے باوجود فوجی سرداروں کے دباؤ سے اس کو شہنشاہ کا منصب قبول کرنا پڑا۔ پرٹناکس نے وہ تمام ظالمانہ محاصل منسوخ کر دیئے جو کموڈس نے ایجاد کیے تھے۔ اس نے اپنے ایک اعلان میں بتایا کہ وہ ایک غریب جمہوریہ پر انصاف کے ساتھ حکومت کرنے کو اس سے بہتر سمجھتا ہے کہ ظالمانہ طریقوں سے دولت حاصل کرے۔ اس نے اعلان میں اس بات پر زور دیا کہ کفایت شعاری اور محنت و جفاکشی دولت پیدا کرنے کا اصلی اور سب سے بہتر ذریعہ ہے، چنانچہ اپنی محنت اور کفایت شعارانہ نظم و نسق سے اس نے ملکی ضروریات کے لیے کافی آمدنی پیدا کر لی۔ شاہی محل کے مصارف تقریباً نصف رہ گئے، عیش و عشرت کے تمام سامان مثلاً سونے اور چاندی کے برتن، عمدہ عمدہ گاڑیاں، ریشم کے قیمتی مگر غیر ضروری ملبوسات اور بہت سی حسین لڑکیاں اور لڑکے جو شاہی محل میں غلاموں کی حیثیت سے کام کرتے تھے نیلام کر دیئے گئے۔ پرٹناکس کی اس روش نے عوام کے دل میں اس کی بے حد قدر و محبت پیدا کر دی۔ لیکن رومی قوم اتنے عرصہ دراز سے اخلاقی امراض اور عیش و عشرت کی عادات میں مبتلا تھی کہ اس کی اتنی جلد اصلاح کرنا ایک ناممکن امر تھا، چنانچہ پرٹناکس کو اپنی مصالحانہ کوششوں کی بدولت بہت جلد تخت حکومت سے ہاتھ دھونا پڑا۔ پریطوری محافظ دستہ جو سابقہ ادوار کی آرام پسندیوں اور عیش پرستیوں کا دلدادہ تھا۔ اس کی کفایت شعاری اور نظم و ضبط سے سخت برہم ہو گیا۔ ان فوجیوں کو گزشتہ عہد حکومت کی دلچسپیوں کی یاد ہر وقت غیر مطمئن رکھتی تھی۔ چنانچہ کموڈس کی موت کے چھیاسی روز بعد پریطوریوں کی سازش سے پرٹناکس کو اپنے خلوص، صداقت اور اصلاح پسندی کی قیمت ادا کرنی پڑی اور دو سپاہیوں نے فوجی کیمپ میں اس کا کام تمام کر دیا۔

پریطوری دستہ کا نظام

ان پریطوری محافظ دستوں کی تاریخ بیان کرتے ہوئے گبن لکھتا ہے:

اس فوج کا قیام آغسطس کی کوششوں سے عمل میں آیا تھا۔ یہ چالاک مگر مستبد حکمران جانتا تھا کہ وہ صرف فوجی طاقت کے بل پر اپنی ظالمانہ حکومت قائم رکھ سکتا ہے۔ اس لیے اس نے اپنی ذاتی حفاظت نیز سنات کو ڈرانے دھمکانے اور بغاوتوں کو فرو کرنے کے لیے رفتہ رفتہ اس محافظ فوج کی تشکیل کی۔ چنانچہ اس فوج کے سپاہیوں کو عام فوجیوں کے مقابلہ میں دوگنی تنخواہ ملتی تھی اور اس کے علاوہ انھیں بہت سی مخصوص مراعات بھی دی گئیں۔ لیکن چوں کہ دارالسلطنت میں اس فوج کے قیام سے عوام میں ناراضگی پھیلنے کا اندیشہ تھا اس لیے اس نے روم میں صرف تین دستے مقرر کیے اور بقیہ دستوں کا اطالیہ کے دوسرے شہروں میں جو روم سے زیادہ قریب تھے بھیج دیا۔ ایک متمول شہر کی عیش پسندانہ فضا میں رہتے رہتے پریطوری سپاہیوں میں اپنی طاقت وشوکت کا غرور پیدا ہوگیا۔ وہ جانتے تھے کہ خود شہنشاہ اپنی ذات کی حفاظت کے لیے اس کا دست نگر ہے۔ نیز سنات کا اقتدار، ملک کا خزانہ اور ایک وسیع سلطنت کا قلب ومرکز بھی انھیں کے رحم وکرم پر ہے۔ ان کے اس احساس طاقت کو قابو میں رکھنے کے لیے بادشاہوں کو یہ ضروری معلوم ہوا کہ وہ یکے بعد دیگرے نرمی اور سختی، محبت اور طاقت، خوشامد اور رعب وداب سے کام لے کر انھیں قابو میں رکھیں۔

پریطوریوں نے پرٹناکس کو تو قتل کر دیا لیکن اس کی جانشینی کے لیے وہ کسی موزوں آدمی کا انتخاب نہ کر سکے۔ پسی سی نس نے جو پرٹناکس کا خسر تھا پریطوریوں کے لالچ سے فائدہ اٹھا کر انھیں ایک بہت بڑی رقم رشوت کے طور پر پیش کی تاکہ وہ اس کو شہنشاہی کی مسند پر بٹھا دیں لیکن پریطوریوں نے علی الاعلان کہہ دیا کہ وہ شہنشاہ اسی کو بنائیں گے جو انھیں سب سے زیادہ رشوت کھلا سکے۔ اس اعلان سے پورے دارالسطنت میں شرم وغیرت کی لہر دوڑ گئی۔ لیکن جب یہ خبر ڈی ڈلیس جولیانس کے کانوں میں پہنچی جو ایک متمول رکن سنات تھا اور ان قومی مصائب میں دل کھول کر داد عیش دے رہا تھا تو اس نے پسی سی نس کے پانچ ہزار

رومی سکوں (ایک سو ساٹھ پاؤنڈ) کے مقابلہ میں ساڑھے چھ ہزار سکوں کی پیش کش کی جو تقریباً دو سو پاؤنڈ کے برابر ہوتے ہیں، چنانچہ پریطوریوں نے فوراً اس کی وفاداری کا حلف اٹھالیا اور سنات کو حکم دیا کہ وہ اپنا اجلاس منعقد کر کے جولیانس کی شہنشاہی کا اعلان کر دے۔

ادھر پانونی فوج کے کمانڈر سپٹی میس سیویرس نے جو افریقہ کا باشندہ تھا پرٹناکس کے قتل کی خبر پاتے ہی فوج کو جمع کیا اور پریطوریوں کے مظالم کی داستان بیان کر کے اسے انتقام پر ابھارا۔ اس کے علاوہ اس کے ہر سپاہی کو تقریباً چار سو پونڈ کی رقم دینے کا وعدہ کیا جو جولیانس کی پیش کردہ رقم سے دوگنی تھی۔ چنانچہ اس کی فوج نے فوراً اسے شہنشاہ تسلیم کر لیا اور بالآخر وہ اس فوج کی طاقت سے اپنے حریف جولیانس پر غالب آ گیا اور روم کا مستقل شہنشاہ بن بیٹھا۔

مالی مشکلات اور عوام پر محاصل کا بار

کموڈس کی عیش پرستی اور ظلم و ستم اس کی موت کے بعد رومیوں کی باہمی خانہ جنگی نیز سیویرس کی نئی پالیسی کا مجموعی اثر یہ ہوا کہ فوج کی طاقت بہت بڑھ گئی اور روما کی رہی سہی قانونی اور دستوری آزادیاں بھی جن کا صرف نام ہی نام رہ گیا تھا بالکل ختم ہو گئیں۔ اس اندرونی انقلاب نے سلطنت کے نظام کو بالکل کھوکھلا کر دیا۔ البتہ اس دور کا ایک مشہور واقعہ یہ تھا کہ کیرا کلا نے رومی شہریت کے حقوق و مراعات صوبوں کے باشندوں کو بھی عطا کیے جن سے وہ اب تک محروم تھے۔ لیکن یہ فیاضانہ پالیسی کسی حقیقی بہی خواہی کا نتیجہ نہ تھی بلکہ محض طمع اور ہوس دولت پر مبنی تھی جس کی توجیہہ ذیل کے واقعات سے ہو گی۔

ویائی کا محاصرہ جو رومیوں کا پہلا بڑا معرکہ تھا ان کی ناتجربہ کاری کے باعث دس سال کی مدت تک طول کھینچ گیا۔

اتنی بہت سی سرمائی مہموں کی سختیاں اور وہ بھی گھر سے بیس میل کے فاصلہ پر بغیر اس کے ناممکن تھیں کہ رومی سپاہیوں کی باقاعدہ تنخواہیں مقرر کر دی جائیں، چنانچہ ان تنخواہوں کی ادائیگی کا انتظام اس طرح کیا گیا کہ تمام رومی باشندے ایک عام محصول ادا کرتے تھے جو ان کی املاک کے تناسب سے وصول کیا جاتا تھا۔ ویائی کی فتح کے دو سو سال بعد تک جمہوریہ

روما کی فتوحات نے اہل روم کی آمدنی اور دولت میں کوئی اضافہ نہیں کیا۔ البتہ ان کی سلطنت کی وسعت روز بروز بڑھتی گئی۔ قرطاجنہ سے لڑائیوں میں جن میں بڑی بڑی افواج نے حصہ لیا ان کی تنخواہوں اور مصارف کی ادائیگی رومیوں کے اپنے ذمہ تھی کیوں کہ روما کی آمدنی کا کوئی بیرونی ذریعہ نہیں تھا۔ عالی ہمت رومیوں نے ان غیر معمولی مصارف کو بلا جبرواکراہ خوشی خوشی اپنی گرہ سے ادا کرنا منظور کیا، ان کی یہ توقع غلط ثابت نہیں ہوئی کہ اس قربانی سے آئندہ چل کر انھیں کئی گنا زیادہ نفع وصول ہوگا۔ چنانچہ سائیرا کیوز، قرطاجنہ، مقدونیہ اور ایشیا کی دولت رومی باشندوں کے ہاتھ آئی۔ اس طرح اہل روما ہمیشہ کے لیے محاصل کے بار سے بچ گئے، ملک کی بڑھتی ہوئی آمدنی فوج اور نظم ونسق کے مصارف کے لیے کافی ہو جاتی تھی اور اس میں سے جو رقم فاضل ہو کر بچ جاتی وہ ایک مشہور دیوتا کے مندر میں محفوظ کردی جاتی تا کہ کسی آڑے وقت کام آسکے۔ پامپی کی فتوحات نے روما کی دولت اور وسائل آمدنی میں بے انتہا اضافہ کیا۔ ایشیا کے محاصل کی آمدنی پانچ کروڑ رومی سکوں یعنی تقریباً چالیس کروڑ پاؤنڈ ہوگئی۔ آخری بطلیموسی حکمران کے تحت مصر کے محاصل سے ساڑھے بیس لاکھ پاؤنڈ آمدنی ہوتی تھی۔ اسپین کی فتح نے جو زمانہ قدیم میں سونے کی کان کہلاتا تھا، اس بے شمار دولت میں مزید اضافہ کیا۔ اس صوبہ کے ہر حصہ میں سونے، چاندی اور تانبے کی لاتعداد کانیں تھیں۔ صرف ایک کان سے جو کارتھیجنیا کے قریب واقع تھی، تین لاکھ پاؤنڈ سالانہ کی چاندی برآمد ہوتی تھی۔ آمدنی کے ان غیر معمولی ذرائع کے باوجود جب اغسطس نے زمام حکومت ہاتھ میں لی تو اسے آمدنی کے ناکافی ہونے کا شکوہ تھا۔ چنانچہ اس نے ابتدا ہی میں یہ خیال ظاہر کیا کہ روما اور اطالیہ کو فوج اور نظم ونسق کے مصارف میں حصہ لینا چاہیے۔ لیکن اس ارادہ کی تکمیل میں اس نے تدریج اور احتیاط کو ملحوظ رکھا۔ چنانچہ کسٹم کا محصول عاید کرنے کے بعد اس نے چنگی کا ایک نیا محصول لگایا۔ اس کے بعد روما کے شہریوں کی شخصی جائیداد اور املاک پر نیا محصول لگایا۔ اسی زمانہ میں روما میں درآمد ہونے والے سامان پر بھی محصول عائد کیا گیا۔ چنانچہ صوبوں سے جتنی اشیائے تکلفات روم میں

آتی تھیں ان پر محصول لیا جاتا تھا۔ یہ محصول صوبہ جاتی تاجروں کو نہیں بلکہ بالواسطہ رومی شہریوں کو دینا پڑتا تھا۔ پھر جب آغسطس نے سلطنت کی مدافعت کے لیے ایک مستقل فوج کی ترتیب و تنظیم کی تو اس نے وصایا اور وراثت پر ایک نیا محصول عاید کیا جس کی شرح پانچ فی صد تھی۔ چوں کہ اس محصول کا دائرہ روم اور اطالیہ تک محدود نہ تھا بلکہ رومی شہریت سے مستفید ہونے والے تمام باشندے خواہ وہ سلطنت کے کسی حصہ میں سکونت پذیر ہوں اس کی ادائیگی کے ذمہ دار تھے۔ اس لیے رومی شہریت کی توسیع کے ساتھ ساتھ اس محصول کی آمدنی میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ لوگوں کو اس محصول کی ادائیگی ناگوار نہیں تھی کیوں کہ رومی شہریت کے حق سے مستفید ہونے کے باعث ان کے مراتب و اعزازات میں اضافہ ہونے کے علاوہ انھیں ملکی اور فوجی عہدوں کے حصول میں بھی آسانی ہوتی تھی۔ لیکن رومی شہریت کے اس خصوصی اعزاز و امتیاز کو کیرا کلا نے ختم کر دیا جب کہ 212ء میں اس نے رومی شہریت کا حق عام کر کے صوبوں کے تمام باشندوں کو رومی شہری قرار دیا۔ اس تبدیلی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب صوبوں کے باشندوں کو رومی شہریت میں کوئی خصوصی اعزاز و امتیاز محسوس نہیں ہوتا تھا۔ کیوں کہ سلطنت کا ہر باشندہ رومی شہری ہو گیا تھا، البتہ اس برائے نام اعزاز کے بدلہ میں ان کے محاصل اور مالی ذمہ داریوں میں کئی گنا زیادہ اضافہ ہو گیا۔ اور درحقیقت کیرا کلا کی نیت بھی یہی تھی کہ رومی شہریت کو عام کر کے صوبوں کے تمام باشندوں کو مزید محاصل کی ادائیگی پر مجبور کیا جائے۔ اس کے علاوہ کیرا کلا نے وصایا اور ریاستوں پر دس فی صد کے بجائے بیس فی صد محصول لینا شروع کیا۔ جب صوبوں کے کل باشندے رومی شہری بن گئے تو انھیں بجا طور پر یہ توقع ہوئی کہ وہ ان تمام محاصل سے مستثنیٰ کر دیے جائیں گے جو انھیں محکوم رعایا کی حیثیت سے ادا کرنے پڑتے تھے۔ لیکن کیرا کلا نے ان سے جدید اور قدیم دونوں محاصل وصول کیے۔

جب تک روم اور اطالیہ کو سلطنت کے قلب اور مرکز کی حیثیت سے ایک خاص مرتبہ حاصل تھا وہاں کے باشندوں میں ایک قومی جوش پایا جاتا تھا۔ صوبوں کے جو افراد رومی

شہریت حاصل کر کے اطالیہ یا روم میں بس جاتے تھے، ان میں بھی اس قومی شعور کا گہرا اثر پیدا ہو جاتا تھا۔ فوج کے بڑے بڑے عہدوں پر اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد فائز تھے جو اپنے ملکی قوانین اور قومی ادب و ثقافت کی روایات سے ناآشنا نہ تھے اور جنھیں تدریجاً سول اور فوجی مناصب پر ترقی ملتی رہتی تھی۔ لیکن جب کیراکلا نے رومی شہریت عام کر دی تو تعلیم یافتہ اور مہذب اشخاص نے فوج کے مقابلہ میں وکالت اور عدالت کے پیشوں کو ترجیح دینی شروع کی یہاں تک فوج کے پورے نظام پر سرحدی علاقوں کے کاشت کار اور وحشی اقوام کے افراد چھا گئے جنھیں نہ ملکی قوانین سے واقفیت تھی اور نہ روما کی قومی اور ثقافتی روایت سے۔ اگرچہ انھوں نے اپنی وحشت و بربریت کے ساتھ سلطنت کی سرحدوں کو محفوظ رکھنے میں بڑی جانفشانی اور بڑی جان نثاری سے کام لیا۔ لیکن شہنشاہوں کے عزل و نصب اور ملکی سیاسیات میں دخیل ہو جانے سے داخلی بدنظمی اور انتشار کا دور دورہ شروع ہو گیا۔

داخلی کمزوریاں

تیسری صدی عیسوی میں سلطنت روما کے داخلی نظام کی کیفیت گبن نے حسب ذیل طریقہ پر بیان کی ہے:

''جب سے رومولس بانی روم نے چرواہوں کی چھوٹی سی جمعیت کے ساتھ دریائے ٹائبر کے قریب چند پہاڑیوں کو اپنا مسکن قرار دیا تھا اس وقت سے اب تک دس صدیاں گزر چکی تھیں۔ رومی تاریخ کے پہلے چار سو سال میں رومیوں نے افلاس اور تنگی کی درس گاہ میں جنگ جوئی اور حکمرانی کی صفات پیدا کر لیں۔ ان خصوصیات کے باعث اور قسمت کی یاوری سے انھوں نے آئندہ تین سو سال کے عرصہ میں یورپ، ایشیا اور افریقہ کے بیشتر ممالک فتح کر لیے۔ آخری تین سو سال ظاہری ترقی اور حقیقی زوال کے ایام تھے۔ سپاہیوں و قانون دانوں اور ماہرین سیاست کی یہ قوم اپنی عادات و افکار میں کسی طرح سلطنت کی دوسری قوموں سے ممتاز نہ تھی۔ جن کی غلامانہ ذہنیت رومی شہریت اور رومی روایات آزادی کے باوجود اپنی جگہ جوں کی توں

برقرار تھی۔ کرایہ کی ایک فوج جو سرحدی علاقوں کے باشندوں اور وحشی اقوام میں سے بھرتی کی جاتی تھی البتہ صحیح معنوں میں آزاد تھی۔ لیکن کبھی کبھی وہ اس آزادی کا بے جا فائدہ بھی اٹھالیتی تھی۔ اسی فوج کے ہنگامہ خیز انتخاب نے کبھی ایک شامی کبھی ایک قوطی اور کبھی ایک عرب کو روم کا شہنشاہ بنا دیا۔''

سلطنت روما کے حدود اب بھی بحر اطلانتک سے دجلہ تک اور دریائے ہائن سے ڈینیوب تک وسیع تھے۔ ایک سطحی نظر رکھنے والا شخص اسی نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ فلپ اعرب شہنشاہ روم کی حکومت اتنی ہی مستحکم اور طاقت ور ہے جتنی ھیڈریاں یا آغسطس کی۔ اس میں شک نہیں کہ ظاہری آثار و اشکال کے لحاظ سے ان دونوں زمانوں میں کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا تھا لیکن سلطنت کی اصلی قوت ضعیف ہو چکی تھی۔ عیش و عشرت کی عادات اور ظالمانہ محاصل کے بار نے لوگوں کے اندر محنت و جانفشانی اور ایثار و قربانی کا مادہ فنا کر دیا تھا۔ فوج کے نظم و ضبط کو جو اس عمارت کا واحد ستون تھا شہنشاہوں نے اپنے ذاتی اغراض کی خاطر طمع و لالچ اور دیگر مادی محرکات کے غیر معمولی اور بکثرت استعمال سے درہم برہم کر دیا تھا۔ سرحدوں کا استحکام جو قلعہ بندیوں پر نہیں بلکہ روما کی فوجی اسپرٹ پر موقوف تھا رفتہ رفتہ کمزور ہو گیا اور زرخیز ترین صوبے وحشی اقوام کی لوٹ مار کی آماجگاہ بن گئے کیوں کہ ان اقوام کو سلطنت کے اندرونی ضعف کا پورا پورا احساس تھا۔

وحشی اقوام اور رومیوں کی عادات واطوار اور طرز زندگی کا مقابلہ

ٹیسی ٹس کے زمانہ میں جرمن پڑھنے لکھنے کے فن سے بالکل ناواقف تھے۔ اس مورخ کا بیان ہے کہ اس کے زمانہ میں جرمنوں کے ملک میں کوئی شہر نہیں پایا جاتا تھا۔ اس کے چھوٹے چھوٹے مکان پتھر، اینٹ یا کھپروں کے بجائے مٹی کے بنے ہوئے ہوتے تھے۔ ملک میں اناج بہت کم مقدار میں پیدا ہوتا تھا اور باغبانی سے یہ لوگ بالکل ناآشنا تھے۔ جرمنی کے جنگل جانوروں سے بکثرت بھرے پڑے ہوئے تھے۔ ان ہی جانوروں کا شکار کر کے یہ لوگ اپنا پیٹ پالتے تھے۔ چاندی، سونے اور لوہے کے استعمال سے یہ لوگ بہت

کم واقف تھے۔ ان کے ہتھیاروں میں لوہے کا جزو بالکل ناپید تھا۔ روما سے تجارتی تعلقات رکھنے کی وجہ سے دریائے رہائن کے قریب بسنے والے جرمنوں میں سکوں کا رواج پایا جاتا تھا لیکن اندرون ملک کے باشندے سکوں کے استعمال سے ناواقف تھے۔

جرمنی کے بیشتر حصوں میں ملک کا طرز حکومت جمہوری تھا، اگرچہ ان کے جمہوری نظام کا کوئی لکھا ہوا دستور موجود نہ تھا اور نہ ان کے کوئی باقاعدہ ملکی قوانین تھے۔ قبائل کے جنگجو افراد کی ایک مجلس معینہ اوقات پر جمع ہوتی تھی، اس کے علاوہ ناگہانی صورت حال میں بھی اس کا فوری انعقاد عمل میں آتا تھا۔ بڑے بڑے جرائم کی سزا اور مجسٹریٹوں کا انتخاب اسی مجلس کو تفویض تھا نیز جنگ اور صلح کے مسائل کا تصفیہ اسی کے ہاتھوں میں تھا۔ بعض وقت اس قسم کے اہم مسائل پر فوجی سرداروں کی ایک علیحدہ مجلس میں قبل از وقت غور و خوض کے بعد تجاویز مرتب کر لی جاتی تھیں۔

جرمنوں کی عورتیں عفت اور پاک دامنی کا نمونہ تھیں۔ ان میں تعدد ازدواج کا رواج بہت کم تھا۔ صرف بڑے بڑے امرا اور سردار اپنے سیاسی مصالح کی بنا پر ایک سے زیادہ بیویاں رکھتے تھے۔ طلاق قانوناً ممنوع نہ تھی لیکن عموماً سوسائٹی میں معیوب سمجھی جاتی تھی۔ زنا کی سزا دینے میں زانی یا زانیہ کی دولت، مرتبہ یا حسن کا کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا تھا۔ رومن مورخ ٹیسی ٹس رومی خواتین اور عام عورتوں کی بدچلنی کا وحشی جرمن عورتوں کی پاک دامنی اور عفت سے مقابلہ کر کے اظہار افسوس کرتا ہے۔

لباس کی تراش خراش اور چال ڈھال کی نزاکت سے انسانی احساسات میں اشتعال پیدا ہوتا ہے۔ پرتکلف دعوتیں، رقص و سرود کی شبینہ محفلیں اور شہوت افزا مناظر نسوانی کمزوریوں کے لیے ابتلاء و آزمائش کے مواقع پیدا کر دیتے ہیں۔ وحشی جرمنوں کی عورتیں اور لڑکیاں اپنی گھریلو مصروفیتوں اور اپنے غربت و افلاس کے باعث ان خطرات سے محفوظ تھیں لیکن جرمن اپنی عورتوں کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ان سے ہر اہم معاملہ میں مشورہ لیتے تھے، ان کا عقیدہ تھا کہ عورتوں کے سینے دانش مندی اور تقدس کے مسکن و مولد ہیں۔

وحشی جرمنوں کے حملوں کے وقت ان کے خیموں میں عورتوں کا بے پناہ ہجوم ہوتا تھا اور یہ عورتیں لڑائی کی ہنگامہ خیزی اور تباہ کاری سے مطلق خائف نہیں ہوتی تھیں۔

رومیوں کی جنگی صلاحیت پر عیش و عشرت کی عادات کا اثر

لوہے کے استعمال سے قومیں سیم و زر کے وسائل پر قابو حاصل کر لیتی ہیں لیکن جرمنی کے وحشی قبائل ان دونوں کے استعمال سے نا آشنا تھے۔ جرمنی کے گھوڑے نہ تو حسن و جمال کے اعتبار سے ممتاز تھے اور نہ کثرت پیداوار کے اعتبار سے۔ نہ ہی جرمنوں کو شہسواری کے فن میں رومیوں کی سی مشق و مہارت حاصل تھی۔ پھر بھی جرمنی کے چند قبائل نے فن شہسواری میں نام پیدا کر لیا تھا۔ اس طرح جرمنوں کی طاقت کا دارومدار ان کی پیدل فوج پر تھا نہ کہ گھوڑے سواروں پر۔ جب اس امر کا لحاظ رکھا جائے کہ رومی سپاہی ساز و سامان جنگ اور اسلحہ سے لیس ہوتے تھے۔ باقاعدہ فوجی مشق و تربیت اور فن حرب کی تعلیم حاصل کرتے تھے ان کی قلعہ بندیاں نہایت مستحکم تھیں، ان کے پاس فوجی گاڑیاں نہایت اعلیٰ درجہ کی ہوتی تھیں تو یہ امر حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح وحشی جرمن اپنی بے سروسامانی اور جنگی ناواقفیت کے باوجود رومی فوجوں کا میدان جنگ میں سامنا کرتے تھے۔ اصل میں ان دونوں حریفوں کا کوئی مقابلہ ہی نہ تھا اور رومیوں کے مقابلہ میں جرمن ایک منٹ بھی میدان جنگ نہیں ٹھہر سکتے تھے لیکن وسائل عیش کی کثرت اور آرام و راحت کی طلب نے رومیوں کی جسمانی اور ذہنی طاقتوں کو کمزور کر دیا تھا۔ ان کی فوجوں میں نظم و ضبط کی کمی ہوتی جا رہی تھی۔ مزید برآں سرحدی علاقوں کے جرمن قبائل کو امدادی لشکر کی حیثیت سے فوجی تنظیم میں داخل کر کے رومیوں نے اپنے لیے خود ہی ایک بڑا خطرہ پیدا کر لیا تھا۔

رومیوں اور وحشیوں کی جنگیں

عرب نژاد فلپ کے بعد ۲۵۰ء میں ڈی سی ایس رومیوں کا شہنشاہ مقرر ہوا۔ اس نے چند ہی ماہ حکومت کی تھی کہ سرحد پر قوطیون کے ایک بہت بڑے حملہ کی خبر ملی یہ پہلا موقع تھا

جب رومیوں کی تاریخ میں قوطی قوم کا تذکرہ ملتا ہے جنھوں نے بعد میں روما کی طاقت کو پاش پاش کر کے اطالیہ، فرانس اور سپین پر اپنی حکومت قائم کی۔ ڈی سی ایس کو اطلاع ملی کہ سنوا جو قوطیون کا بادشاہ تھا ایک بڑی فوج کے ساتھ دریائے ڈینیوب کو پار کر چکا ہے اور صوبہ میسیا میں اس کی فوج نے قتل و غارت کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ ڈی سی ایس اس حملہ کے تعاقب میں ایک دشوار گزار اور پُر خطر ملک سے گزرتا ہوا فلپو پولس پہنچا جس کا قوطیون نے محاصرہ کر لیا تھا۔

جب اپنے خیال کے مطابق وہ ایک محفوظ مقام پر پہنچ گیا جو قوطی فوج کے عقب سے بہت دور تھا تو قوطی فوجوں نے اسے گھیر لیا اور اس طرح پہلی مرتبہ ایک رومی شہنشاہ کو وحشیوں کے ہاتھوں سے بھاگ کھڑا ہونا پڑا۔ قوطیوں نے ایک طویل محاصرہ کے بعد فلپو پولس پر قبضہ کر لیا۔ اس شکست نے ڈی سی ایس کو رومی سلطنت کی کمزوریوں کا جائزہ لینے پر مجبور کیا۔ اس نے غور و خوض کے بعد محسوس کیا کہ عوام الناس کی اخلاقی حالت کو درست کرنے اور رومی قوانین کا از سرِ نو احترام قائم کرنے سے ہی سلطنت کی حالت ٹھیک ہو سکتی ہے۔ چنانچہ اس نے محتسب کے قدیم عہدہ کا احیا کیا اور اس عہدہ پر ویلریان کا تقرر کیا۔ نیز اس نے یہ بھی اعلان کر دیا کہ محتسب کے فیصلوں کو ملکی قانون کے مساوی درجہ دیا جائے گا اور سلطنت کے بڑے بڑے عہدہ دار بھی محتسب کی نگرانی سے آزادانہ ہوں گے۔ ویلریان کو اس عہدہ کے حصول کی کوئی خوشی نہیں ہوئی کیوں کہ وہ اتنی بھاری ذمہ داری کو قبول کرتے ہوئے ہچکچاتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ رومیوں کی اخلاقی حالت تقریباً لا علاج ہو گئی ہے۔ ایک محتسب قومی اخلاق کے مزید زوال و خرابی کا دروازہ بند کر سکتا ہے لیکن جو خرابیاں جڑ پکڑ چکی ہوں انھیں رفع کرنا اس کے لیے ناممکن ہے۔ سچ یہ ہے کہ قوطیون کو زیر کرنا آسان لیکن عوام کے اخلاقی انحطاط کا مداوا کرنا ایک امر دشوار تھا۔ ڈی سی ایس کو اس آسان تر کام میں اپنی فوج اور اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑا۔ دوسرے کام کا ذکر۔ قوطیون کو رومی افواج نے ہر طرف سے گھیر لیا تھا۔ ان کی فوج کا بہترین حصہ فلپو پولس کے محاصرہ میں ضائع ہو چکا تھا۔ ان حالات میں ان کو اس بات

پر رضا مند کر لینا کوئی دشوار امر نہ تھا کہ بغیر لڑے بھڑے وہ اپنے گھروں کو واپس چلے جائیں بشرطیکہ رومی ان کے قیدیوں کو رہا کر دیتے اور مال غنیمت انھیں واپس کر دینے پر آمادہ ہو جاتے لیکن شہنشاہ ڈی سی ایس کو اپنی فوجی قوت پر اتنا اعتماد تھا کہ اس نے صلح کی کوئی شرط منظور نہیں کی۔ وحشی قوطیون نے مجبور ہو کر شکست پر موت کو ترجیح دینا پسند کیا اور اپنی پوری طاقت کے ساتھ میدان جنگ میں ڈٹے رہے۔ اول اول انھیں کچھ دور پیچھے ہٹتے ہی بنی اور ان کی کئی فوجوں کو رومی شہنشاہ کے ہاتھوں بری طرح فوجی شکست اٹھانی پڑی۔ لیکن جب رومی فوج ان کا تعاقب کرتی ہوئی ایک دلدلی علاقہ میں پہنچ گئی تو لڑائی کا پانسہ پلٹ گیا اور قوطیون نے پوری رومی فوج کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے یہاں تک کہ خود ڈی سی ایس بھی اس لڑائی میں جان سے مارا گیا۔ اس کی وفات کے بعد اس کے لڑکے ہوسٹی لیانس کو بادشاہ بنا دیا گیا لیکن چوں کہ وہ نوعمر اور ناتجربہ کار تھا، اس لیے گیلس کو ہم مرتبہ شہنشاہ قرار دے کر ملک کے سیاہ وسپید کا مالک بنا دیا گیا۔ اس شہنشاہ نے پہلا کام یہ کیا کہ الیریا کے علاقہ کے تمام صوبوں کو فاتح قوطیون کے ہاتھ میں رہنے دیا بلکہ بڑے بڑے ممتاز رومیوں کو جو جنگ میں قوطیون کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے تھے، ان کے حوالے کر دینے پر رضا مند ہو گیا۔ اس کے علاوہ اس نے یہ بھی وعدہ کیا کہ اگر وہ آئندہ سے رومی علاقوں پر تاخت وتاراج کا سلسلہ موقوف کر دیں تو انھیں سونے کی شکل میں ایک بہت بڑی سالانہ رقم دی جایا کرے گی۔

روما کے جمہوری دور میں بڑے بڑے متمول بادشاہ جو روم کی حفاظت اور سرپرستی کے طلبگار ہوئے رومی حکمرانوں کے ہاتھ سے نہایت ادنیٰ قسم کے تحفے قبول کرنے کو اپنے لیے شرف وعزت کا باعث سمجھتے تھے۔ اس کے بعد جب رومی جمہوریت سلطنت میں تبدیل ہو گئی اور دنیا بھر کی دولت وثروت کھنچ کھنچ کر روم میں جمع ہونے لگی تو روم کی باج گذار ریاستوں اور ہمسایہ ممالک کے ساتھ خوشگوار تعلقات قائم رکھنے اور ان پر رومی عظمت کا سکہ جمانے کے لیے شہنشاہ روم انھیں نہایت فیاضانہ مالی عطیات اور تحائف دیا کرتے تھے۔ یہ فیاضانہ عطیات رومی حکومت کی دوست نوازی کا نتیجہ ہوتے تھے اور کسی کے دل میں اس وقت یہ

خیال بھی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ رومی سلطنت کسی خوف یا کمزوری کی بنا پر ان عطیات و وظائف کی تقسیم عمل میں لا رہی ہے لیکن گیلس نے جو سالانہ رقم وحشی قوطیون کو دینی منظور کی وہ علانیہ طور پر ایک ذلت آمیز خراج کی شکل رکھتی تھی۔ رومی ذہن ابھی تک ان باتوں کا عادی نہ تھا۔ اس لیے گیلس کے خلاف عوام میں ایک عام برہمی پیدا ہوگئی۔ حالانکہ اس نے یہ کام بدرجہ مجبوری اور از راہ مصلحت شناسی کیا تھا لیکن رومیوں میں اور زیادہ ناراضگی اس وقت پھیلی جب انھیں معلوم ہوا کہ اس قومی ذلت کے باوجود جو انھیں خراج کی صورت میں سہنی پڑی تھی ملک کا امن واطمینان اب بھی وحشی جرمنوں کے ہاتھ سے محفوظ نہ تھا، بات یہ تھی کہ دنیا پر اب یہ راز کھل گیا تھا کہ روم دولت وثروت کے اعتبار سے قوی لیکن فوجی قوت اور سیاسی استحکام کے نقطہ نظر سے کمزور ہے۔ وحشیوں کے نئے نئے گروہ جن کی ہمتیں قوطیوں کی کامیابی سے اور زیادہ بڑھ گئی تھیں اور جو معاہدات کی پابندی سے آزاد تھے صوبوں کو تاخت وتاراج کرنے لگے یہاں تک کہ دارالسلطنت بھی ان کی تباہ کاریوں سے محفوظ نہ تھا۔

۲۵۳ء تا ۲۶۳ء میں جب کہ ویلریان اور اس کا نوجوان بیٹا گیلی نس روم کے حکمران تھے۔ جرمنی کے مشرقی حصہ کے باشندے جو فرینک کہلاتے تھے موجودہ علاقہ فرانس پر جو اس زمانہ میں گال کہلاتا تھا حملہ آور ہوئے۔ ان لوگوں نے دریائے رہائن کو پار کر کے نہ صرف فرانس بلکہ اسپین تک کو اپنے حملوں کی آماجگاہ بنالیا۔ گیلی نس کے دورِ حکومت میں حملہ آور فرینک قوم سے اسپین کی سرزمین پر بڑی خون ریز لڑائیاں ہوئیں۔ پھر ان کا سیلاب اسپین سے نکل کر شمالی افریقہ کے علاقہ تک پھیل گیا۔

ویلریان اور گیلی نیس کے زمانہ میں جرمنوں اور سرماطیون نے دریائے ڈینیوب کی سرحدوں پر مسلسل حملے کیے لیکن رومیوں نے ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا کیوں کہ جن صوبوں میں لڑائی کا بازار گرم تھا ان کے باشندے بڑے سخت جان اور رومی فوج کے دست و بازو تھے۔ اگرچہ وحشی جرمن کبھی کبھی مقدونیہ اور اطالیہ کی سرحدوں تک پہنچ جاتے تھے لیکن انھیں وہاں سے مار بھگا دیا جاتا لیکن قوطیون نے اب رومی علاقہ کے ایک حصہ پر اپنا وار شروع

کیا۔ اس عرصہ میں یہ قوم یوکرین کے علاقہ میں منتقل ہو گئی تھی۔ یہاں سے انھوں نے ایشیائے کوچک کے رومی صوبہ پر حملے کرنے شروع کیے۔ ان کا ایک بہت بڑا بیڑا ترزان کی مشہور بندرگاہ پر حملہ آور ہوا۔ اس شہر کی مدافعتی فوج کو عیش و نشاط میں مصروف پا کر قوطی شہر پناہ کی دیواروں پر چڑھ گئے اور رات کی خاموشی میں شہر کے اندر داخل ہو گئے۔ انھوں نے ہزاروں انسانوں کو تہ تیغ کر دیا، ہزاروں لاکھوں کو قیدی بنایا اور لاتعداد مال غنیمت لے کر نہایت کامیابی سے اپنے وطن واپس گئے۔ اس کے بعد قوطیون کا ایک اور حملہ زیادہ فوجوں اور زیادہ ساز و سامان کے ساتھ ایک نئے رخ سے شروع ہوا۔ اب کی مرتبہ ایشیائے کوچک کے بجائے یونان ان کی تاخت و تاراج کا مرکز بنا۔ چالسڈن کی قلعہ بند رومی افواج نے جو تعداد اور ساز و سامان میں وحشی حملہ آوروں سے بہت برتر تھیں بغیر لڑے بھڑے شہر کو قوطیون کے حوالہ کر دیا۔ اگر یہاں پر قوطیون سے جم کر مقابلہ کیا جاتا تو یونان اور اطالیہ کے دوسرے شہروں کو ان کے حملہ کا زور نہ سہنا پڑتا۔ تھیبیس، آرگوس، کارنتھ اور اسپارٹا یکے بعد دیگرے قوطیون کے قیامت خیز حملوں کا شکار ہوئے لیکن ان کی مدافعت کا کوئی معقول انتظام نہ ہو سکا یہاں تک کہ اب قوطی اطالیہ کی سرحد پر پہنچ گئے، اس وقت گیلی نیس عیش و نشاط سے چونکا اور اس نے خود میدان جنگ میں آ کر حملہ آوروں کا مقابلہ کیا۔ شہنشاہ کی موجودگی نے حملہ آوروں پر اچھا اثر ڈالا اور ان کا جوش کسی قدر ٹھنڈا پڑ گیا۔ نالوبیٹس نے جو قوم کا سردار تھا رومیوں کی اطاعت قبول کر لی اور اپنے بہت سے ہم قوم افراد کے ساتھ اس نے رومی سلطنت کی ملازمت اختیار کی۔ اس کو رومی قونصل کا مرتبہ اور اعزاز دیا گیا اور روما کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ تھا جب کہ وحشی اقوام کے ایک فرد کو رومیوں کا ہم مرتبہ تسلیم کر لینا ضروری محسوس ہوا۔

عین اسی زمانہ میں جب کہ رومی سلطنت پر ہر طرف آثار زوال طاری تھے ایرانی سلطنت کی طاقت و قوت بڑھتی جا رہی تھی۔ شاپور نے جو ایک زبردست اور طاقتور ایرانی حکمران گزرا ہے آرمینیا کی ریاست پر قبضہ کر لیا جو رومی حکومت کی باجگزار تھی۔ ستائیس

سال تک رومیوں کی یہ حلیف ریاست ایرانیوں کی محکوم رہی۔اس کامیابی نے شاپور کی ہمت کو اور زیادہ بلند کر دیا۔اس نے نصیبین اور کارتھی کی طاقتور رومی افواج سے ہتھیار رکھوا کر انھیں ایرانیوں کی اطاعت قبول کرنے پر مجبور کیا اور دریائے فرات کے دونوں جانب رومیوں پر حملے شروع کر دیئے۔شہنشاہ ویلیریان کو رومیوں کی پیہم شکستوں نے بالآخر اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ خود میدان جنگ میں ایرانیوں کے مقابلہ پر آئے۔چنانچہ کبرسنی کے باوجود اس نے دریائے فرات پار کر کے ایرانیوں پر لشکر کشی کی لیکن الروحہ کے مقام پر شاپور نے اس کو ایک سخت شکست دے کر گرفتار کر لیا۔اس عظیم الشان فتح نے شاپور کے حوصلے اور زیادہ بلند کر دیئے۔اس نے رومی سلطنت کی حکمرانی کے لیے ایک ایسے شخص کا انتخاب کیا جو بالکل اس کی مرضی پر چلتا تھا۔چنانچہ سائیریڈز کو جو انطاکیہ کا ایک غیر معروف باشندہ تھا ویلیریان کا جانشین مقرر کیا گیا اور رومی فوج کو چار و ناچار اس کی اطاعت قبول کرنی پڑی۔

ویلیریان کی موت کے بعد رومی تخت کے کم سے کم تیس دعوے دار اٹھ کھڑے ہوئے جنھوں نے اس کے بیٹے گیلی نیس کا مقابلہ کر کے حصول سلطنت کی کوشش کی۔یہ حریف دعویدار مرکز سلطنت سے نہیں بلکہ صوبوں سے اٹھے تھے۔چنانچہ مشرق میں Balista' cyriades 'Macrianus آذینہ Odenathus زینب Zenobia 'فرانس اور مغربی صوبوں میں Victorinus Lollianus اس کی ماں وکٹوریہ Marius اور Tetricus، ڈینیوب کے علاقہ میں Ingenus Resillianus اور Aurelios اسی طرح دوسرے صوبوں میں دیگر اشخاص نے فوجوں کی تائید سے اپنی شہنشاہی کا اعلان کیا۔ان میں سے اکثر دعوے دار ایسے تھے جنھیں سلطنت کی آرزو نہ تھی بلکہ محض اپنی جان اور عزت کے خوف سے وہ اس جراتمندانہ اقدام پر مجبور ہوئے تھے۔ تخت سلطنت کا ایک دعویدار بھی ایسا نہ تھا جو اپنی فطری موت سے مرا ہو یا جسے زندگی میں ایک روز بھی چین نصیب ہوا ہو۔جونہی کوئی شخص مرتبہ حکومت پر سرفراز ہوتا اس کے حامیوں اور مددگاروں کے دل میں وہی اندیشے اور حوصلے پیدا ہو جاتے جو اس کی اپنی باغیانہ

کارروائیوں کے محرک تھے، اور بالآخر وہ گھریلو سازشوں، فوجی بغاوتوں اور خانہ جنگیوں میں مبتلا ہو کر جلد ہی کسی قاتل کے حملہ کا شکار ہو جاتا۔

شہنشاہ کلاڈیس ۲۶۸ء نے اپنے زمانہ حکومت میں وحشی قبائل کی سرکوبی کر کے ان کے اقدامات کو روک دیا لیکن آریلین کے زمانہ میں انھوں نے پھر سر اٹھایا۔ آریلین نے ان کا سخت اور مردانہ وار مقابلہ کیا اور طرفین تھک کر بالآخر صلح پر آمادہ ہو گئے۔ قوطیون نے وعدہ کیا کہ اپنی فوج میں سے رومی افواج کو دو ہزار امدادی سپاہی دیں گے بشرطیکہ انھیں پرامن طریقہ سے اپنے ملک میں مراجعت کی اجازت دی جائے۔ آریلین نے صوبہ ڈیشیا سے اپنی فوجیں ہٹا کر اس علاقہ کو قوطیون کے لیے خالی کر دیا۔ اب ڈیشیا ایک خود مختار صوبہ بن گیا جو رومی علاقہ اور وحشی قبائل کے مابین حد فاصل تھا۔ یہاں کے رومی باشندوں نے قوطیون اور دیگر وحشی اقوام کی غلامی کو بطیّب خاطر منظور کیا۔ انھوں نے اپنے نئے فاتحین یعنی قوطیون کو زراعت، تجارت اور تمدن کے دیگر علوم وفنون سے آشنا کیا۔ ڈیشیا اور رومی سلطنت کے درمیان تجارتی تعلقات بڑھتے گئے اور یہ خود مختار صوبہ شمالی جرمنی کے وحشی قبائل کی راہ میں ایک دیوار آہن کی طرح حائل ہو گیا کیوں کہ جرمنی کے جن وحشی قبائل نے یہاں سکونت اختیار کر لی تھی انھوں نے فائدہ اسی میں محسوس کیا کہ رومیوں کے ساتھ مل کر سرحد پار کے وحشی قبائل کے خلاف اس صوبہ کی حفاظت کریں۔ بات یہ تھی کہ رومیوں سے ان کے تجارتی اور معاشی مفادات وابستہ تھے۔ اس لیے ان قوطی فاتحین نے نئے حملہ آوروں کے مقابلہ میں صوبہ ڈیشیا کی مدافعت کے لیے بڑی جانفشانی سے کام کیا۔

آریلین کی وفات کے بعد وحشی اقوام کا سیلاب سلطنت روما کی طرف پھر بڑھنا شروع ہوا۔ لیکن پرولیس نے اپنے چھ سالہ دور حکومت میں ان کا مردانہ وار مقابلہ کر کے رومی سرحدات کو پھر محفوظ کر دیا۔ اس شہنشاہ نے جرمنی کے وحشی قبائل کو پیہم شکستیں دے کر انھیں رومیوں سے دب کر صلح کرنے پر مجبور کیا۔ شرائط صلح میں ایک شرط یہ تھی کہ وحشی قبائل ہر سال اپنے سولہ ہزار تندرست اور مضبوط نوجوانوں کو فوج میں بھرتی کریں۔ شہنشاہ ان

غیر مہذب مگر طاقتور رنگروٹوں کو پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ کی ٹکڑیوں میں سلطنت کے مختلف حصوں کی رومی افواج میں شریک کر دیتا اور انھیں کسی ایک مقام پر جمع ہونے دیتا تھا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ رومی سلطنت کو جو فوجی امداد جرمن وحشی قبائل کی بدولت حاصل ہو رہی ہے اس کا رومی عوام کو احساس نہ ہونا چاہیے۔ ان قوموں کی امداد اب سلطنت روما کے لیے ضروری ہو گئی تھی۔ اطالیہ اور سلطنت کے دوسرے اندرونی علاقوں کی آبادی عیش و تنعم کی زندگی سے اتنی کمزور ہو گئی تھی کہ اس کی طاقت پر بھروسہ کرنا ناممکن تھا۔ ڈینیوب اور رہائن کی سرحدوں کے سخت جان باشندے اب بھی وہ دل و دماغ پیدا کرتے تھے جو میدان جنگ کی صبر آزما تکالیف کو بہ آسانی برداشت کر سکتے تھے۔ لیکن لڑائیوں کے ایک طول طویل سلسلہ سے ان علاقوں کی آبادی بہت گھٹ گئی تھی، زراعت اور کھیتی باڑی کی بربادی اور نکاح و ازدواج کی کمی نے نہ صرف زمانہ موجودہ کی طاقت کے وسائل بند کر دیئے تھے بلکہ آئندہ کی امید بھی منقطع کر دی تھی۔ پرولیس کا یہ اقدام بڑا دانشمندانہ تھا کہ اس نے رومی سرحدوں کی حفاظت کے لیے وحشی جرمن قبائل کی نو آبادیاں قائم کیں اور ان کے لیے اراضی، آلات زراعت اور مویشیوں کی فراہمی کا انتظام کیا لیکن پرولیس کی اکثر توقعات پوری نہ ہو سکیں۔ وحشی قوموں کے افراد زراعت و فلاحت کی صبر آزمائی سے گھبرا اٹھتے تھے۔ ان کے آزاد منش طبائع اکثر اوقات انھیں مطلق العنانی اور استبداد کے خلاف آمادہ بغاوت کر دیتے تھے جن سے نہ صرف انھیں خود نقصان ہوتا بلکہ سلطنت میں بھی ضعف پیدا ہوتا۔

ڈائیوکلیشن کے زمانہ میں رومی سلطنت نے جو نئی وضع اختیار کی اس کے بارے میں ایک انگریز مصنف جان بی فرتھ اپنی کتاب قسطنطین اعظم میں لکھتا ہے:

ڈائیوکلیشن نے رومانی طرز حکومت میں ایک بڑا انقلاب یہ پیدا کیا کہ اس کو بالکل مشرقی رنگ میں رنگ دیا۔ ہر قسم کے شاہانہ تکلفات اور خسروانی جاہ و حشم کے سامان جو مشرقی درباروں سے مخصوص تھے اور جن کو رومانی مذاق قبول نہ کرتا تھا اختیار کر لیے۔ اب یہ رومانی حکمران مشرق کا ایک تاج دار بن گیا۔ وہ جواہرات سے مرصع زرق برق

لباس پہنتا تھا، جو لوگ اس کے سامنے آتے وہ فوجی سلام نہ کرتے تھے بلکہ گھٹنے ٹیک کر سر جھکاتے ہوئے آگے بڑھتے تھے۔ اب فوجی حکام ہر وقت گرد و پیش نہ رہتے تھے بلکہ محل کے متعلقین اور ملازمین کا ہجوم رہتا تھا۔ یہ کہنا شاید درست نہ ہو کہ یہ انقلاب محض ظاہر پرستی کے شوق نے پیدا کیا تھا یا ایک کم حوصلہ طبیعت رکھنے کی وجہ سے ظاہر ہوا تھا جو رسمی باتوں میں نمائش اور طمطراق پسند کرتی ہے کیوں کہ ڈائیوک لیشن اس پایہ کا آدمی تھا کہ اس کی طبیعت کو ایسی کمزوریوں سے منسوب کرنا صحیح نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک اس انقلاب کی بڑی وجہ غالباً یہ تھی کہ خود قوم نے اپنے قدیم استحقاق سے کہ وہ ایک آزاد اور بذات خود حکمران قوم کہلائی جائے دست برداری اختیار کر لی اور غلام بننے کے لیے تیار ہو گئی۔ شہنشاہ گیلی نیوس نے جس وقت سنات کے جملہ متعلقین کو فوجی خدمات و اعزازات سے محروم کر دیا تو مجلس نے دم نہ مارا اور جب ایسے ہی مضمون کا فرمان جاری ہوا تو اراکین مجلس نے اس کو بے چون و چرا تسلیم کر لیا۔

گزشتہ صفحات میں ہم نے رومی سلطنت کے دور زوال کے کچھ حالات بیان کیے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قومی سیرت کی وہ کون کون سی کمزوریاں تھیں جو اس زبردست سلطنت کے ضعف و شکست کا باعث ہوئیں۔ ساتھ ہی یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ رومیوں کی ایک بڑی عمدہ صفت ان کی وسیع القلبی اور عالی ظرفی تھی۔ ان کا اجتماعی مزاج قومی اور نسلی تعصبات سے بالکل بیگانہ تھا۔ اس اہم خصوصیت کے باعث ان کی سلطنت کو عرصہ دراز تک کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ انھوں نے اپنی عظیم الشان سلطنت میں محکوم اقوام کو مساوی سیاسی اور تمدنی حقوق عطا کیے۔ یہاں تک کہ ان قوموں کے ممتاز اور قابل افراد کو انھوں نے رومی تخت و تاج سے بھی سرفراز کیا جس کی وجہ سے رومی سلطنت کو ہر نسل اور ہر قوم کے بہترین افراد کی خدمات سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملا اور یہی سبب تھا کہ رومی سلطنت اندرونی ضعف و انتشار کے باوجود اتنے طویل عرصہ تک دنیا پر غالب رہی۔ رومی سلطنت کے اس مخصوص پہلو پر تبصرہ کرتے ہوئے گبن لکھتا ہے:

"رومی سلطنت کے مختلف صوبوں میں رفتہ رفتہ ایک نئی رومی قوم وجود میں آ گئی۔ یہ اس طرح ہوا کہ اول تو رومیوں نے مختلف صوبوں میں اپنی بہت سی نو آبادیاں قائم کیں۔ دوسرے انھوں نے صوبوں کے اصلی باشندوں میں سے وفادار اور مستحق اشخاص کو رومی شہریت کے حقوق عطا کیے۔ علاقہ گال فرانس کے باشندے جنھوں نے جولیس سیزر کا مردانہ وار مقابلہ کیا تھا، انھیں کے پوتوں اور پڑپوتوں نے رومی افواج کی قیادت سنبھال لی، صوبوں کے حاکم بنائے گئے اور رومی سنات کی رکنیت سے سرفراز کیے گئے۔ اس طرح مفتوح اقوام آپس کے اختلاط سے ایک متحدہ قوم بن گئیں۔ انھوں نے اپنی آزادی اور خود مختاری سے نہ صرف دست برداری حاصل کی بلکہ اس کی بازیابی کی تمنا بھی ان کے دلوں سے مٹ گئی۔ رومی قومیت سے علیحدہ ہونے کا تصور بھی اب ان پر شاق گزرتا تھا۔"

مغربی تہذیب

مغرب کی عظیم الشان تہذیب جس نے گزشتہ تین سو سال میں مشرقی ممالک پر اپنا سکہ جمایا اور ان ملکوں کے خیالات و معتقدات، طرز رہائش اور طریق حکومت پر گہرے اثرات مرتب کیے، ۱۹۱۴ء کے بعد سے مسلسل روبہ انحطاط ہے۔ مشرق بعید میں چین کی سرزمین سے مغربی ممالک بالکل بے دخل ہو چکے ہیں۔ ملایا اور ہند چینی میں مغربی ملوکیت کے خلاف عوام کی کشمکش اور جدوجہد جاری ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد ولندیزی طاقت کو چارو ناچار اپنا اقتدار انڈونیشیا سے اٹھا لینا پڑا۔ برما، ہندوستان اور پاکستان سے انگریزوں نے خود ہی دست برداری اختیار کر لی اور اب ان ممالک سے انگریزی اور امریکی اثرات کا رفتہ رفتہ خاتمہ ہو رہا ہے۔ مشرق وسطیٰ میں ایران اور مصر مغربی طاقتوں کے مقابلہ میں اپنی آزادی کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں اور سارے عرب ممالک میں مغربی ملوکیت کے خلاف ایک عام بیزاری پیدا ہو گئی ہے۔ یہ حالات بتا رہے ہیں کہ مغربی تہذیب جس کی نمائندگی فرانس، انگلستان اور امریکہ کر رہے ہیں اب دنیا سے رخصت ہو رہی ہے۔ معین طور سے یہ کہنا مشکل ہے کہ اس کے خاتمہ میں کتنا عرصہ لگے گا لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مغربی اقوام اب اپنی طاقت اور عروج کے نصف النہار سے گزر کر پوری سرعت کے ساتھ آمادہ زوال ہیں۔

مغربی تہذیب کے زوال و انحطاط سے بحث کرنے میں ایک عام غلطی یہ کی جاتی ہے کہ مغرب کے مختلف ممالک کو الگ الگ کر کے ہر ایک ملک کی تاریخ پر جداگانہ نظر ڈالی جاتی ہے۔ حالانکہ فرانس، انگلستان، ہالینڈ، امریکہ اور دوسرے مغربی ممالک ایک ہی تہذیب کی مختلف شاخیں ہیں اور ان کی تاریخ ایک بین الاقوامی تمدن کی مسلسل داستان ہے۔ اس لیے

تاریخ کے فلسفی کو ان ممالک پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالنی چاہیے اور انھیں ایک ہی تہذیب کے نمائندوں کی حیثیت سے دیکھنا چاہیے۔ اسی نقطہ نظر کے تحت ہم فرانس کی شکست و بربادی کے حالات قلمبند کرتے ہیں۔ اس کے بعد امریکہ اور انگلستان کی تاریخ سے جستہ جستہ واقعات پیش کریں گے۔ بحیثیت مجموعی ان تمام واقعات پر نظر ڈالنی چاہیے اور انھیں ایک ہی تہذیب کے نمائندوں کی حیثیت سے دیکھنا چاہیے۔ اسی نقطہ نظر کے تحت ہم فرانس کی شکست و بربادی کے حالات قلم بند کرتے ہیں۔ اس کے بعد امریکہ اور انگلستان کی تاریخ سے جستہ جستہ واقعات پیش کریں گے۔ بحیثیت مجموعی ان تمام واقعات پر نظر ڈالنے سے واضح ہوگا کہ ان سب ممالک میں انحطاط اور زوال کا جو عمل جاری ہے اس کے بنیادی اسباب رومی تہذیب کے زوال کے اسباب سے مختلف نہیں ہیں اور قرآن نے اقوام کے زوال کی جو مشترک خصوصیات بیان کی ہیں ان کا اطلاق ان دونوں تہذیبوں پر کیا جاسکتا ہے۔

(الف) فرانس

فرانس کی اجداد پرستی اور تقلیدی روش

فرانس جیسی قوم جس نے یورپ میں جمہوریت کی بنیاد رکھی تھی عقلی آزادی اور اجتہادی قوت سے محروم ہو کر کس طرح آبا پرستی اور تقلید اجداد میں گرفتار ہوگئی اور اس طرز عمل کے سیاسی اثرات کیا ہوئے اس کے متعلق (Pierre Kaillaud) اپنی کتاب فرانس میں لکھتا ہے:

> پرولتاریہ (مزدور) طبقہ کے مسئلہ کو مختلف حکومتوں نے مختلف طریقوں سے حل کیا ہے۔ فرانس میں صنعتی ترقی انگلستان اور جرمنی کے مقابلہ میں زیادہ تدریجی اور سست رفتار تھی۔ مزدوروں کی انجمنوں کے پھیلاؤ اور وسعت کے باوجود فرانسیسی حکومت نے اس معاشی اور سماجی مسئلہ سے نپٹنے کی کوئی حقیقی کوشش نہیں کی۔ مزید خرابی اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ فرانس میں مزدوروں کی انجمنیں اپنے اثر اور تعداد رکنیت کے اعتبار سے

اتنی قوی نہ تھیں جتنی انگلستان کی انجمنیں۔ جنگ عظیم کے بعد بھی فرانس کے بیشتر صنعتی ادارے مزدوروں کی اجرتوں کا تعین کرنے میں مروجہ معاشی حالات کا کوئی لحاظ نہیں کرتے تھے۔

یہ امر حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے کہ فرانسیسی قوم جس نے قدیم جاگیری نظام کو تبدیل کرنے میں پہل کی تھی، وہی اب معاشی اور سماجی اصلاح کے کام میں سب سے پیچھے تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ فرانسیسی جو دستوری جمہوریت قائم کرنے میں کئی بار ناکامیاں اٹھا چکے تھے، جنگ عظیم کے بعد بھی انھی روایات پر زندگی بسر کر رہے تھے جو ان کے جمہوری انقلاب کی پیداوار تھیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس انقلاب (انقلاب فرانس) کے اصولوں میں تمام جدید مسائل کا حل موجود ہے۔ یہ خیال کر کے کہ انسان کی آزادی اور مساوات کا اعلان کیا جا چکا ہے، خاندانی اور موروثی حقوق و مراعات کا وجود مٹایا جا چکا ہے۔ قدیم پابندیاں اور غلامانہ سماجی بیڑیاں کاٹی جا چکی ہیں۔ قومی زندگی میں ایسے قوانین کا نفاذ عمل میں آ چکا ہے جو بلا استثنا ہر شہری کے لیے واجب الاطاعت ہیں۔ ہر عاقل و بالغ کو حق رائے دہی مل چکا ہے اور تعلیم سب کے لیے مفت ہوگئی ہے۔ انقلاب فرانس کے حامیوں اور وارثوں نے قدرتی طور پر اس کی پیدا کردہ روایات کو اپنے جدید مسائل کے لیے بھی کافی سمجھا اور یہ بھول گئے کہ تازہ مسائل کی نوعیت انقلاب فرانس کے مسائل سے مختلف ہے۔ اس انقلاب کے وارث اور حامی ہر پارٹی سے تعلق رکھتے تھے کیوں کہ فرانس کی تمام سیاسی پارٹیاں خواہ وہ قدامت پسندوں کی ہوں، اعتدال پسندوں کی ہوں یا سوشلسٹوں کی اپنے سیاسی پروگرام اور اعلانات میں انقلاب فرانس کے اصولوں سے استشہاد و استدلال کرتی تھیں اور ان کی روش جدید مسائل حیات کے بارے میں قدامت پسندانہ تھی کیوں کہ انقلاب فرانس کے اصول اٹھارہویں صدی کے لیے کتنے ہی مفید ہوں، بیسویں صدی کے مسائل کو حل کرنے کے لیے ناکافی تھے۔

فرانس میں طبقاتی کشمکش

بیسویں صدی میں فرانس کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس کی آبادی دو بڑے حصوں میں منقسم تھی جن کے مفادات ایک دوسرے سے بالکل جدا بلکہ متصادم تھے یعنی شہری آبادی اور دیہی آبادی۔ فرانسیسی پارلیمنٹ میں ایک بھی ایسی پارٹی نہ تھی جو دیہی آبادی یعنی کسانوں کے مفاد کی حمایت کرتی۔ فرانس کو دو معاشی مسائل کا حل دریافت کرنا ضروری تھا۔ پہلا مسئلہ صنعتی مزدوروں کا تھا جن کے حقوق کا کوئی تعین نہیں کیا گیا۔ دوسرا مسئلہ دیہی کسانوں کا تھا جن کا مفاد قوم کے دوسرے طبقوں سے متصادم تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قیمتوں کے تعین میں پیدا کنندگان اور صارفین کے مفاد ایک دوسرے کے خلاف تھے۔ برسر اقتدار سیاسی جماعتوں کی حکومتیں ان مسائل سے عہدہ برا ہونے میں ناکام رہیں۔ ان کے فیصلوں سے اگر ایک گروہ راضی اور مطمئن ہو جاتا تو دوسرے گروہ میں ناراضگی اور برہمی پیدا ہو جاتی کیوں کہ یہ جماعتیں مسائل کو ان کی جڑ سے حل کرنے کے بجائے سطحی اور ظاہری پہلوؤں سے حل کرنا چاہتی تھیں اور بنیادی خرابیوں کو دیکھنے کے بجائے اوپر سے لیپ پوت کر کے معاملات کو درست کرنے کی فکر میں رہتی تھیں۔

فرانسیسیوں کی بے عقیدگی

روکٹ، ہناد اور استاوسکی کے شرمناک واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اہل فرانس بالکل بے عقیدہ ہو گئے تھے اور ان کی نظر میں اخلاقی اور معاشرتی جرائم کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہی تھی۔ افسوس کی بات یہ نہ تھی کہ بعض مجرمین پاداش جرم میں مبتلا تھے بلکہ یہ کہ عوام الناس عام طور پر محسوس کرتے تھے کہ جو لوگ ان مجرموں کو سزائیں دے رہے ہیں انھیں خود مجرموں کے کٹہرے میں جگہ ملنی چاہیے۔ فرانس میں پارلیمانی اداروں کا کوئی احترام باقی نہیں رہا تھا کیوں کہ ان کے ذریعے سے ملک کے معاشی مسائل کے حل کرنے کا کوئی امکان نہیں معلوم ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ جب عوام کو اپنے نمائندوں پر اعتماد باقی نہیں رہا تو قوم کے مال دار اور با اثر مگر بد اعمال اشخاص کے لیے آسان ہو گیا کہ وہ اس عام غفلت و بے اعتنائی سے فائدہ اٹھا کر

اپنی پوزیشن کو مستحکم کرنے کی کوشش کریں، جعل وفریب کے ان واقعات سے اتنی بڑی خرابیاں نہ پیدا ہوتیں اگر فرانس کی قومی زندگی کی بنیادیں ہل نہ چکی ہوتیں۔ کسی اصول وعقیدہ پر افراد قوم کا ایمان نہ رکھنا ہر اخلاقی تعلیم اور روحانی نظریہ کو شک بھری نظروں سے دیکھنا اور اس پر باندازِ تمسخر معترض رہنا نیز زندگی کے بارے میں کوئی مستقل اور مستحکم نقطہ نظر نہ رکھنا یہ امراض اخلاقی جرائم اور سیاسی فریب دہی سے بھی زیادہ خطرناک اور مہلک تھے کیونکہ اس بے عقیدگی اور اخلاقی کھوکھلے پن کی وجہ سے مجرموں کو یہ یقین ہو جاتا تھا کہ ان پر احتساب اور گرفت کرنے میں رائے عامہ کوئی قوی دباؤ نہیں ڈالے گی۔ ہر قوم میں اسٹاوسکی پیدا ہو سکتے ہیں لیکن ایک زندہ اور بیدار قوم ایسے اشخاص کو کچل کر رکھ دیتی ہے۔

فرانس میں جمہوریت کا غلط ارتقا

فرانس کے لوگوں کو انقلاب فرانس پر بڑا ناز تھا لیکن اس انقلاب کے بارے میں ایک دردناک حقیقت یہ ہے کہ فرانس کے امرا اور جاگیردار طبقہ نے اس کے اصولوں کو بطیّبِ خاطر قبول نہیں کیا کیوں کہ اس کی وجہ سے وہ اپنی خصوصی مراعات سے محروم ہو گئے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہت اور جاگیرداری کے خاتمہ کے بعد ان طبقات نے جن کو انقلاب فرانس سے نقصان پہنچا تھا نئے جمہوری نظام کو مٹانے یا کمزور کرنے کی بڑی سخت کوششیں کیں۔ اسی نقطہ نظر سے فرانسیسی جمہوریت کے نشو وارتقا کے حالات بیان کرتے ہوئے۔ این ڈی پرٹ اپنی کتاب ''زوال جمہوریہ فرانس''

The Fall Of The French Republic میں لکھتا ہے:

''فرانسیسی جمہوریت ۱۸۷۰ء اور ۱۸۷۱ء کے واقعات سے معرض ظہور میں آئی تھی یعنی فرانس اور پرشیا کی جنگ سے۔ شہنشاہ لوئی نپولین کو جس بات نے پرشیا سے جنگ پر آمادہ کیا وہ یہ تھی کہ فرانس کا مزدور طبقہ اور عام لوگ اس کے خلاف تھے۔ یہ اندرونی کمزوری جس نے سلطنت کو مبتلائے جنگ کر دیا اس کی شکست و بربادی کا موجب بھی ہوئی۔ دوسری جمہوریت کے لیڈر بیرونی دشمن سے دل کھول کر لڑتے

ہوئے اس لیے گھبراتے تھے کہ انھیں اندرون ملک اپنے مخالفین یعنی مزدوروں اور عوام کی طاقت کا مقابلہ کرنا تھا اور اس اندرونی دشمن کا خوف ان پر جرمنوں کے خوف سے زیادہ غالب تھا''۔

فرانس اور پرشیا کی جنگ میں فرانس کو بری طرح شکست ہوئی۔ دوسری جمہوریت ایک گھروندے کی طرح بیٹھ گئی اور شہنشاہ لوئی نپولین کو انگلستان میں پناہ لینی پڑی۔ جرمنوں سے عارضی صلح کی بات چیت تھیرس نے کی جو ایک منتخب کردہ مجلس موسومہ کمیون کے تحت کام کر رہی تھی۔ اس طرح عارضی صلح کے چند ہفتوں کے بعد فرانس میں دو حکومتیں کام کر رہی تھیں۔ لیکن آخر کار ایک وحشیانہ خانہ جنگی کے بعد تھیرس کی حکومت نے پیرس کمیون کا استیصال کر دیا۔ متمول طبقات کی نمائندہ تھیرس کی حکومت نے مزدوروں سے بڑا سخت انتقام لیا اور تقریباً تیس ہزار مزدوروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا لیکن اپنی سترہ روزہ عمر کے دوران میں پیرس کمیون نے ایک نئے طرز حکومت کا ڈھانچہ کھڑا کر دیا تھا جس کو زمانہ آئندہ کے تمام انقلابیوں نے بطور نمونہ پیش نظر رکھا۔

پیرس کمیون کے استیصال کے بعد کئی سال تک فرانس کے ارباب حل و عقد یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ ملک میں کس قسم کا نظام حکومت قائم کیا جائے۔ جس چیمبر (مجلس) کا انتخاب عمل میں آیا تھا اس کی اکثریت رجعت پسندوں اور شاہی حکومت کے حامیوں پر مشتمل تھی لیکن اس میں اتنی جرات نہ تھی کہ وہ علانیہ شاہی طرز حکومت کو از سر نو قائم کرنے کی کوشش کرے۔ رجعت پسند ارکان مجلس اور بادشاہت کے حامیوں کو معلوم تھا کہ اگرچہ عوام کی تحریک آزادی کو بری طرح پامال کر دیا گیا ہے لیکن وہ بادشاہت کے دوبارہ قیام کو گوارا نہیں کریں گے اور اگر اس کی کوشش کی گئی تو عوامی تحریک کا عرصہ دراز تک مقابلہ کرنا پڑے گا اور بہت ممکن ہے کہ انقلابی تحریک پھر ایک مرتبہ زور پکڑ جائے۔ اس لیے ۱۸۷۸ء میں فرانس کے ارباب حل و عقد نے یہ فیصلہ کیا کہ جمہوریت کا قیام عمل میں لایا جائے۔ لیکن جن لوگوں نے یہ تصفیہ کیا وہ اسے ایک عارضی انتظام سمجھتے تھے اور موقع کے منتظر ہی تھے کہ ساز گار حالات

پیدا ہونے پر بادشاہت کا قیام پھر ایک بار عمل میں لایا جائے۔ فرانس کے صدر حکومت مارشل میک موہن نے شاہی حکومت کے لیے حالات سازگار بنانے کی جان توڑ کوشش کی اور جب ۱۸۷۷ء میں اس کو شکست ہوئی تب بھی بادشاہت پسندوں نے جمہوری حکومت کو ایک ناگزیر برائی کے طور پر قبول کرنا گوارا کیا اور مسلسل اس کوشش میں لگے رہے کہ کسی نہ کسی طرح شاہی طرز حکومت کے لیے راستہ ہموار کریں۔

اس طرح فرانس کی تیسری جمہوریت جس کا خاتمہ ۱۹۴۰ء میں جرمنوں کے ہاتھوں عمل میں آیا ایک مصالحت کا نتیجہ تھی۔ فرانس کے مالدار حکمران طبقہ نے اس مصالحت کے ذریعے ایک ایسا نظام حکومت قائم کیا جس میں انھیں اپنی دولت اور اپنے اثر و رسوخ کو بڑھانے کے بیش از بیش مواقع موجود تھے اور جس میں عوام کے انقلابی جذبات کے بھڑک اٹھنے کے امکانات کو کم سے کم حد تک گھٹا دیا گیا تھا۔ اسی آخر الذکر خطرہ کو رفع کرنے کے لیے شاہی طرز حکومت کے بجائے جمہوری طرز حکومت اختیار کیا گیا تھا اور زمانہ مابعد میں بھی اسی خطرہ کے پیش نظر کئی جمہوری اصلاحات عمل میں لائی گئیں۔ لیکن مالدار اور متمول طبقوں کی غیر مرئی اور غیر محسوس حکومت اس جمہوری لباس اور ان جمہوری اشکال و مراسم کے باوجود پوری طاقت کے ساتھ قائم رہی۔ فرانس کی نئی نسل جمہوری نظام حکومت کے علاوہ اور کسی طرز حکومت سے ناواقف تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ فرانس کی جمہوریت ایک ایسی عیاری کا نتیجہ تھی جس میں عوام کو جمہوری اصطلاحات اور ادارہ جات کے پردہ میں مالدار اور متمول طبقات کی حکمرانی پر رضامند کر لیا گیا۔ چنانچہ ملک کی اصلی معاشی اور سیاسی طاقت اب بھی انھی طبقات کے ہاتھ میں تھی جو شاہی حکومت کے زمانہ میں اقتدار اور اثر کے مالک تھے۔ دراصل موجودہ زمانہ کی تمام سلطنتوں میں جو ترقی یافتہ صنعت و حرفت اور عالمی تجارت کی بنیادوں پر قائم ہیں، اصلی سیاسی طاقت بڑے بڑے مالدار اور متمول اشخاص کے ایک چھوٹے سے طبقہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے جو ملک کی صنعت و تجارت پر چھائے ہوتے ہیں۔ یہ بڑے بڑے لوگ عوام اور غریب طبقات کی جان و مال پر لامحدود اختیارات رکھتے

ہیں اور انھیں یہ قدرت حاصل ہوتی ہے کہ جن لوگوں سے خوش ہوں انھیں ترقیاں دے کر اپنے ساتھ ملالیں اور جن سے ناراض ہوں ان پر زندگی اور معیشت کے تمام وسائل تنگ کر دیں۔ یہی حالت فرانس کی بھی تھی۔

۱۹۱۸ء کے بعد کا زمانہ

۱۹۱۸ء میں جرمنی کو متحدین کے ہاتھوں بڑی زبردست شکست ہوئی۔ فرانس اپنے حریف کی اس شکست سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ ۱۹۱۸ء کی فتح سے فرانس کے حدود سلطنت میں بے اندازہ توسیع ہوگئی۔ آلسیس لارین (Alsace Lorraine) کا پورا علاقہ پچاس سال کے بعد جرمنوں کے ہاتھ سے نکل کر فرانس کے قبضہ میں آ گیا۔ مغربی افریقہ کی جرمن نو آبادیات کو انگریزوں اور فرانسیسیوں نے باہم تقسیم کر لیا۔ سلطنت عثمانیہ میں سے شام کا وسیع اور زرخیز صوبہ بھی فرانس کے ہاتھ آیا۔ جرمنی کو اس کے برعکس آلسیس لارین کے علاوہ پولینڈ کا ایک بہت بڑا صنعتی اور معدنی علاقہ چھوڑنا پڑا۔ جرمنوں کا جو حصہ ملک ان کے ہاتھوں میں رہ گیا، اس کے بیچوں بیچ پولینڈ کو ایک چھوٹا سا قطعہ دے دیا گیا تھا تا کہ وہ سمندر تک رسائی حاصل کر سکے۔ اس کی وجہ سے جرمنوں کا ملک دو علیحدہ حصوں میں بٹ گیا جن کے درمیان ایک دوسری سلطنت یعنی پولینڈ کا علاقہ حائل تھا۔

مالمیڈی کا ضلع بلجیم کے ہاتھ آیا۔ سارے ضلع سے بھی جرمن چند سال کے لیے محروم کر دیئے گئے۔ اس طرح روس کی سابقہ سلطنت کے بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ اس کے بعض حصے رومانیہ اور پولینڈ کے حوالے کر دیئے گیے۔ بالٹک کے علاقہ میں روسی سلطنت کے ایک وسیع حصہ کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے لتھوانیا، لیٹویا اور فن لینڈ کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کی گئیں۔ یہ صورت حال فرانس کے لیے بہت مفید تھی کیوں کہ اب یورپ میں چار پانچ بڑی بڑی سلطنتوں کے بجائے صرف دو بڑی سلطنتیں رہ گئی تھیں۔ ایک فرانس اور دوسرے انگلستان۔ اطالیہ کو جنگ عظیم سے کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچا اور نہ اس کے اثر و رسوخ یا حدود سلطنت میں کوئی اہم اضافہ عمل میں آیا۔ براعظم یورپ پر فرانس ہی سب سے بڑا اور سب

سے طاقت ور ملک تھا۔ جسے یہ موقع حاصل تھا کہ وہ چھوٹی چھوٹی کمزور سلطنتوں کو اپنی پالیسی اور مرضی کے مطابق جس رخ پر چاہے چلائے لیکن فرانس کے لیے ایک بڑی وجہ تردّد یہ تھی کہ اس کی آبادی صرف چار کروڑ تھی جس میں اضافہ کی طرف کوئی میلان نہ تھا۔ اس کے برخلاف جرمنوں کی آبادی ساڑھے چھ کروڑ تھی اور آئندہ اس میں اضافہ کا بھی امکان تھا اس لیے فرانس کو سب سے پہلے اپنے تحفظ کے وسائل تلاش کرنے ضروری تھے۔ ان وسائل کے حاصل کر لینے کے بعد اس کے آگے دولت مندی اور خوش حالی کے لامحدود مواقع تھے۔

جنگ عظیم کے فاتحین کی پالیسی یہ نہ تھی کہ وہ جرمنی کو اپنا محکوم بنا کر اس ناروا فوائد حاصل کریں بلکہ وہ اس کو چاروں طرف سے گھیرے رکھنا چاہتے تھے۔ دوسرا مقصد یہ تھا کہ روس کی بالشویکی سلطنت کا کسی نہ کسی طرح گلا گھونٹ دیا جائے۔ ان دونوں مقاصد کے حصول میں فرانس کا حکمران طبقہ ایک ممتاز اور نمایاں حصہ لینے کی تیاری کر رہا تھا۔

یورپ کی سیاست کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کی پہلی نمایاں مثال ہمیں اس فوجی حملہ میں ملتی ہے جو فرانس نے شکست خوردہ جرمنی کے صنعتی علاقہ روہر پر ۱۹۲۳ء میں کیا تھا۔ چوں کہ جرمنی کو تاوان جنگ ادا کرنے میں تاخیر ہوئی اس لیے پائین کیر نے روہر کی صنعتی وادی پر قبضہ کر لینے کا فیصلہ کیا۔ جرمنی کی حکومت ابھی اس قابل نہ تھی کہ وہ اس حملہ کی فوجی مدافعت کرتی۔ لیکن اس نے فرانس کے اس اقدام کا ہر دوسرے طریقہ سے مقابلہ کیا جس میں ایک عمومی ہڑتال کا حربہ بھی شامل تھا۔ اس ہنگامہ کی بدولت جرمنی کے سکہ مارک کی قیمت تیزی سے گرنے لگی اور جرمنی میں ایک معاشرتی انقلاب کے آثار نمودار ہونے لگے۔ خود فرانس کے سکہ کی قیمت پر اس معاشی انتشار کا بڑا اثر پڑا۔ کمیونزم کا بھوت رہائین لینڈ بلکہ پورے یورپ کے لیے ایک پریشان کن مسئلہ بن گیا۔ انگلستان کے بینک کار اور سرمایہ دار یورپ پر فرانس کے بڑھتے ہوئے غلبہ کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے اور جرمنی میں انقلاب کے اندیشہ سے خوف زدہ تھے۔ ایک اشتراکی جرمنی کے مقابلہ میں جو روس کا حلیف ہو اس امر کو ترجیح دیتے تھے کہ جرمنی پھر سے سرمایہ داروں کی سرکردگی میں ایک طاقت ور

ملک بن جائے چنانچہ وہ فوراً جرمنی کی مدد کرنے پر آمادہ ہوگئے اور جرمنی پر سے تاوان جنگ کے بوجھ کو ہلکا کرنے کے لیے انھوں نے ایک نیا منصوبہ تیار کیا جسے منصوبہ ڈاز کہا جاتا ہے۔ فرانس کے سرمایہ داروں نے چاروناچار اس منصوبہ کو قبول کیا اور انھوں نے ۱۹۲۴ میں روہر کے علاقہ سے فرانسیسی افواج واپس بلالیں۔ اس شکست کے لیے فرانس کے سرمایہ داروں نے امریکہ اور برطانیہ کے بینک کاروں کو موردِ الزام قرار دیا۔ ان کا یہ الزام صحیح تھا کیوں کہ فرانس کے بڑھتے ہوئے اثر واقتدار کو برطانوی حکومت پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھتی تھی۔ یورپ میں برطانیہ خود اپنی توازنِ قوت کی پالیسی کو بروئے کار لانا چاہتا تھا۔ اس نے فرانس کا ابتدا میں اس لیے ساتھ دیا تھا کہ جرمنی کی طاقت کو شکست دے کر یورپ کو اس کے اقتدار سے محفوظ رکھا جائے۔ اور روس کے اشتراکی نظام کو درہم برہم کر دیا جائے۔ لیکن برطانیہ کو یہ گوارا نہ تھا کہ فرانس کو یورپ کی قیادت حاصل ہو جائے۔ اس مرتبہ کا وہ خود متمنی تھا۔ اس لیے فرانس کے مقابلہ میں برطانیہ جرمنوں کی امداد پر پہنچ گیا۔ تاکہ اس طرح سے وہ ان دونوں پر اپنا اثر قائم رکھے۔ اس کے برخلاف امریکہ فرانس کے خلاف کوئی ایسی کارروائی نہیں کرنا چاہتا تھا جس سے یورپ پر برطانیہ کا اثر واقتدار غالب آ جائے۔ لیکن وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ فرانس اس کے یورپی مفادات میں جا و بے جا مداخلت کرنے کے قابل ہو جائے۔ اس لیے جن صورتوں میں فرانس کے خلاف کارروائی کرنے سے برطانوی اثر ورسوخ کے پھیلنے کا اندیشہ نہ ہوتا، وہاں امریکہ کو فرانس کی پالیسی کو ناکام کرنے کی کوشش میں کوئی تامل نہ تھا۔ اس طرح یہ ظاہر ہے کہ امریکہ اور برطانیہ دونوں ملکوں کے ساہوکار اور تاجر فرانس کے بین الاقوامی منصوبوں کی راہ میں حائل تھے۔

اب سوال یہ ہے کہ برطانیہ اور امریکہ کے سرمایہ داروں کو فرانس کی راہ روکنے میں کیوں کامیابی ہوئی۔ اس کا اصلی سبب فرانس کے داخلی نظام معیشت کی کمزوریاں تھیں۔ فرانس کو اپنی طاقت برقرار رکھنے کے لیے ایک فوجی فتح کے علاوہ جو بعض سازگار حالات اور سیاسی رفاقتوں کا نتیجہ تھی کچھ اور وسائل بھی درکار تھے جو اس کے پاس موجود نہ تھے۔

۱۹۳۰ء میں ایک برطانوی مشاہد نے اعداد و شمار فراہم کر کے یہ ثابت کیا تھا کہ بیسویں صدی میں صرف پانچ علاقے ایسے ہیں جو عالمگیر طاقت کے مرکز بن سکتے ہیں۔ اولاً براعظم امریکہ جس پر ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا اثر غالب تھا۔ دوم برطانیہ، سوم وسطی یورپ، چہارم روس اور پنجم مشرق بعید۔ جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا اس دعویٰ کی تصدیق ہوتی گئی۔ روس کے انقلاب کے بعد ان پانچ مرکزوں میں سے چار سرمایہ داروں کے ہاتھ میں تھے۔ لیکن فرانس ان میں سے کسی میں بھی نہ آتا تھا۔ اس کی فنی مہارت اور معاشی وسائل اتنے ترقی یافتہ نہیں تھے جتنے شکست خوردہ جرمنی یا برطانیہ اور امریکہ کے۔ ان ممالک کے مقابلہ میں اس کے مادی ذرائع محدود تھے۔ فرانسیسی سلطنت تجارتی آمدنی اور معاشی وسائل کا ویسا موثر ذریعہ نہ تھی جیسے سلطنت برطانیہ۔ انیسویں صدی کی آخری ربع صدی میں فرانس کی قوت پیداوار کے اضافہ کی شرح ریاستہائے متحدہ امریکہ اور جرمنی سے کم تھی۔ انگلستان کی قوت پیداوار کا اضافہ بھی تقریباً اتنا ہی سست رفتار تھا لیکن فرق یہ تھا کہ انگریزوں نے گزشتہ صدی میں اپنے حریفوں پر اتنی زبردست سبقت حاصل کر لی تھی کہ ابھی عرصہ تک وہ اس کے فوائد سے متمتع ہو سکتے تھے۔ مزدوروں کی تعداد کے اعتبار سے بھی جرمنی اور فرانس میں بڑا فرق تھا۔ ۱۹۱۳ء میں جرمنوں کی آبادی ۶ کروڑ ستر لاکھ تھی اور فرانس کی صرف چار کروڑ، ۱۹۲۹ء تک جرمنوں کی آبادی ۶ کروڑ چالیس لاکھ رہ گئی تھی۔ لیکن اس کے مقابلہ میں فرانس کی آبادی صرف دس لاکھ بڑھی یعنی فرانسیسیوں کی تعداد چار کروڑ سے چار کروڑ دس لاکھ ہو گئی ان تمام موانع اور دشواریوں کے باوجود فرانس نے بر اعظم یورپ پر اپنا اقتدار جمانے کی کوشش کیوں کی۔ اس کا جواب ہمیں مالیات کی پیچیدگیوں میں ملتا ہے۔ فرانس ایک صنعتی ملک سے زیادہ ایک ساہوکار اور سود خوار ملک بن گیا تھا۔ فرانسیسی باشندوں کا تمام پس انداز کردہ سرمایہ بالخصوص کسانوں کا جمع جتھا فرانس کے بینکوں میں جمع تھا۔ ان بینکوں نے بڑی بڑی رقوم اپنے حلیفوں مثلاً زار روس یا ماتحت یورپی حکومتوں کو بطور قرض دے رکھی تھیں۔ اگر ہم اس سرمایہ کا حساب لگائیں جو

فرانس نے بیرونی ممالک میں لگایا تھا تو معلوم ہوگا کہ یہ بیرونی سرمایہ اس کی قومی آمدنی کا ۱۵ فی صد حصہ تھا۔ حالانکہ ریاستہائے متحدہ امریکہ جیسے مالدار اور متمول ملک کا بیرونی سرمایہ اس کی قومی آمدنی کا صرف (۴) فی صد حصہ تھا، اس طرح فرانس میں دولت کا ارتکاز و اجتماع انتہائی ترقی پر تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ فرانس اب ایک سودخوار ملک بن گیا تھا جس کی آبادی کا بہت بڑا حصہ بغیر محنت و مشقت سود کی آمدنی پر زندگی گزارتا تھا۔ اس صورت حال کا اثر داخلی نظام معیشت پر بھی پڑا۔ بینک آف فرانس اور دوسو خاندان جو اس بینک کے معاملات پر حاوی تھے فرانسیسی سیاست میں غیر معمولی مداخلت کرنے لگے۔ یہی دوسو خاندان فرانس کے اصل حکمران تھے' ان کا حکومت پر اتنا غیر معمولی اثر تھا کہ یہ جس حکومت کو چاہتے شکست دے دیتے۔ قومی اور بین الاقوامی قرضوں کا سارا کاروبار انھیں دوسو خاندانوں کے ہاتھ میں تھا۔ یہ لوگ جب چاہتے اسٹاک ایکسچینج میں ابتری پھیلا دیتے، سرکاری کفالتوں کے دام گرا دیتے اور فرانک کی قیمت بھی گھٹا بڑھا سکتے تھے۔ واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان دوسو خاندانوں کو سب سے زیادہ فکر اپنے اقتدار اور خصوصی مراعات کی تھی۔ اگر ان کی خصوصی مراعات اور اقتدار کو ذرا بھی دھچکا لگتا تو یہ قوم کے مفاد کو نظر انداز کر دینے میں کوئی تامل نہیں کرتے تھے بلکہ بعض وقت قومی مفادات کے بالکل برخلاف پہلے اپنی معاشی اجارہ داری اور اپنے خصوصی اعزازت کی حفاظت کرتے تھے۔ جنگ عظیم کے بعد فرانس میں ایسی جتنی حکومتیں بنیں جن کا رجحان اشتراکیت کی طرف تھا یا جو معاشی عدل و انصاف کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنا چاہتی تھیں انھیں یا تو بنک آف فرانس کے احکام کی تعمیل کرنی پڑی یا وہ مسند اقتدار سے بے دخل ہوگئیں۔

چنانچہ ۱۹۲۴ء میں جب ایڈورڈ ہیریٹ کی اشتراکیت پسند حکومت برسر اقتدار آئی تو فرانس کے لوگوں نے اس سے بڑی بڑی توقعات وابستہ کیں لیکن یہ حکومت صرف دس ماہ قائم رہی اور آخر میں بینک آف فرانس اور اس پر حکومت کرنے والے دوسو خاندانوں نے ہیریٹ وزارت کو مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا۔

فاسطیت کا عروج

اگر فرانس کے حالات کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ فرانس کا جمہوری نظام حکومت صرف ایک ظاہری پردہ تھا اور اصل طاقت چند مالدار خاندانوں کے ہاتھ میں تھی۔ فرانس میں سب سے کثیر التعداد طبقہ چھوٹے بورژوا اور ادنیٰ نے متوسط طبقہ کا تھا۔ کسانوں کی تعداد ایک تہائی تھی۔ انگلستان میں اس کے برعکس کسانوں، زمینداروں اور کاشتکار مزدوروں کی کل تعداد آبادی کا بیسواں حصہ بھی نہ تھی۔ چھوٹے بورژوا اور کسانوں کے علاوہ فرانس میں چھوٹے چھوٹے صنعتکاروں اور بیرونی ممالک سے تجارت کرنے والے سوداگروں کی ایک قلیل تعداد تھی۔ ان سب کے اوپر ساہوکاروں، بینک کاروں اور بڑے بڑے سرمایہ داروں کا وہ طبقہ تھا جو اصل میں فرانسیسی حکومت اور سوسائٹی کا کارفرما عنصر تھا۔ ان لکھ پتی اور کروڑ پتی افراد کے ہاتھ میں فرانس کا نظام حکومت ایک کھلونا بن گیا تھا۔ مال دار طبقات اپنی غیر معمولی قوت زر کے باعث سیاستدانوں اور سرکاری عہدہ داروں کو رشوتیں کھلا کھلا کر پوری حکومت اور نظم ونسق کو جس رخ پر چاہتے موڑ دیتے تھے۔ جب آبادی کی اکثریت یہ محسوس کرتی ہے کہ اس کے برائے نام حقوق بھی مال دار طبقوں کی دست برد اور غیر معمولی قوت زر کے باعث محفوظ نہیں ہیں۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ اگرچہ دستور کی رو سے اور قانون کی نگاہ میں ان کے شہری حقوق دوسرے افراد کے مساوی ہیں لیکن مالدار اور متمول اشخاص وطبقات اپنی معاشی طاقت کے زور سے عملاً جو چاہتے کرتے ہیں اور حالات وواقعات کے رخ کو جدھر چاہتے ہیں موڑ دیتے ہیں اور ان کی آزادی اور مساوات کا صرف نام ہی باقی رہ جاتا ہے تو مذہب، آزادی، اخوت اور مساوات کے نعرے انھیں بالکل کھوکھلے نظر آنے لگتے ہیں اور ایک داخلی ہیجان کے لیے حالات سازگار ہو جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں متوسط طبقات کے لیے دو راستے کھلے رہ جاتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ مزدوروں کے ساتھ مل کر اپنے مفادات کی حفاظت کریں اور مالدار سرمایہ داروں کی منظم معاشی طاقت کا مقابلہ کرنے کے لیے مزدوروں سے اتحاد پیدا کریں۔ دوسرے یہ کہ وہ

سرمایہ داروں کی خوشامد درآمد کر کے ان کے ساتھ مزدوروں اور عوام کے خلاف متحدہ محاذ قائم کر دیں اور اس طریقہ سے مالدار طبقوں کو خوش کر کے ان سے اپنے لیے کچھ مراعات حاصل کر لیں۔ فرانس میں پہلی صورت پیش آئی اور متوسط طبقات نے عوام کے ساتھ مل کر سرمایہ داروں کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کیا جس کو Popular Front کہا جاتا ہے۔ انگلستان میں رمزے میکڈانلڈ اور دوسرے مزدور راہنماؤں نے دوسری صورت اختیار کر کے سرمایہ داروں کا ساتھ دیا۔ جب فرانس میں متوسط الحال افراد اور مزدور طبقہ کا متحدہ محاذ قائم ہو گیا تو مال دار حکمران طبقات بہت گھبرائے اور انھوں نے اپنے داخلی نظام کی کمزوریوں کو چھپانے اور غیر مطمئن عوام کو دبانے کے لیے طرح طرح کی سیاسی تدابیر اختیار کرنی شروع کیں۔ مثلاً انھوں نے فرانسیسی سوویٹ معاہدہ کو جو ۱۹۴۲ء میں طے پایا تھا کالعدم کرنے کے لیے جرمنوں سے ساز باز کرنی شروع کی کیوں کہ انھیں یقین تھا کہ فرانسیسی سوویٹ معاہدہ سے متوسط اور مزدور طبقوں کے متحدہ محاذ کو قوت پہنچے گی۔ اس کے برخلاف جرمنی کے سرمایہ داروں کا ساتھ دینے میں فرانس اور جرمنی دونوں ملکوں کے سرمایہ داروں کا مفاد مشترک تھا۔ اس لیے ہٹلر کے برسر اقتدار آنے سے پہلے فرانس کے مال دار حکمران طبقہ نے جرمنی کے مزدوروں اور عوام کی طاقت کو کمزور کرنے اور اشتراکیت کے بڑھتے ہوئے خطرہ کا سد باب کرنے کے لیے جرمنی کے سرمایہ داروں کی مدد کرنی شروع کی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ دونوں ممالک کے سرمایہ دار مل کر اپنی مشترکہ طاقت سے جرمنی اور فرانس کے غیر مطمئن عوام کی طاقت کو کچل دیں۔ سوویٹ فرانسیسی معاہدہ کو توڑنے کا کام لاوال نے اپنے ہاتھوں میں لیا۔ لاوال کو اس معاہدہ پر مجبوراً دستخط کرنے پڑے تھے لیکن ابھی فرانسیسی پارلیمنٹ کو اس کی توثیق کرنی تھی۔ اس لیے لاوال نے کئی ماہ تک اس کی توثیق کو ملتوی رکھا۔ پھر جب ہٹلر کے برسر اقتدار آنے سے جرمنی کی طاقت بہت زیادہ بڑھنے لگی تو لاوال نے سر جان سائمن رمزے میکڈانلڈ اور مسولینی کے ساتھ مل کر ۱۹۳۵ء میں بمقام آسٹریسا ایک مجلس مشاورت منعقد کی۔ ان تینوں نے ہٹلر کے خلاف جس کی قوت اب

خوفناک انداز سے ترقی کر رہی تھی اس مشاورت کے بعد ایک مشترکہ محاذ قائم کیا جس کو اسٹریسا محاذ کہا جا سکتا ہے۔ اسٹریسا کی مجلس مشاورت میں حبشہ کے مسئلہ کا کوئی ذکر نہیں آیا، حالانکہ مسولینی اس زمانہ میں حبشہ کے خلاف جنگ کی علانیہ تیاریاں کر رہا تھا۔ رمزے میکڈانلڈ نے بھی اس مسئلہ کو نہیں چھیڑا۔ لیکن لاوال اور مسولینی کے درمیان حبشہ کی بابت ایک خفیہ معاہدہ طے پا چکا تھا۔ انگلستان کی رائے عامہ نے حبشہ کی حمایت کے لیے وہاں کی حکومت پر اتنا زبردست اثر ڈالا کہ بالآخر حکومت انگلستان کو مجلس اقوام میں مسولینی کے خلاف اہل حبشہ کی حمایت میں آواز بلند کرنی پڑی۔ اس موقع پر لاوال نے خفیہ طور پر مجلس اقوام میں حبشہ کے مقدمہ کو کمزور کرنے کی پوری پوری جدوجہد کی اور یہ اسی کی کامیاب کوشش کا نتیجہ تھا کہ مجلس اقوام مسولینی کے خلاف حبشہ کے معاملہ میں کوئی عملی اقدام نہ کر سکی۔ پھر یہی لاوال تھا جس نے سر سموئیل ہور کے ساتھ مل کر بالڈون چیمبرلین اور حکومت انگلستان کے دیگر اراکین کے علم و اطلاع میں حبشہ کی تقسیم کے لیے ایک تجویز مرتب کی جو تاریخ میں ہور لاوال تجویز کے نام سے مشہور ہے۔

فرانس کی خارجی حکمت عملی میں جو اس نے جرمنی کے بالمقابل اختیار کی، یہی خوف کام کر رہا تھا کہ مبادا ملک کے غیر مطمئن عوام کی طاقت میں اضافہ ہو جائے اور روس کی اشتراکی حکومت کی تائید کے ساتھ وہ سرمایہ دار طبقوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں۔ اسی خوف کا نتیجہ تھا کہ ہٹلر کے بڑھتے ہوئے خطرہ کو روکنے کے بجائے اس کی جارحانہ کارروائیوں اور توسیعی اقدامات پر خاموشی اختیار کی گئی۔ چنانچہ ۷ مارچ ۱۹۳۶ء کو ہٹلر نے معاہدہ ورسائی کی علانیہ خلاف ورزی کرتے ہوئے رہائن لینڈ کے غیر فوجی علاقہ میں اپنی افواج داخل کر دیں۔ اگر اس وقت فرانسیسی حکومت اپنی فوجوں کا اجتماع عام عمل میں لے آتی تو برطانوی حکومت کو چار و ناچار اس کی پشت پناہی کرنی پڑتی لیکن فوجوں کا اجتماع کرنے کے بجائے فرانسیسی وزرا نے برطانوی حکومت سے مشورہ کرنا ضروری خیال کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ برطانیہ نے فرانس کو اجتماع افواج کے خلاف رائے دی۔ اس کے بجائے اس

نے ہٹلر کو دھمکانے کے لیے اس سے چند سوالات کیے جو معاہدہ ورسائی کی خلاف ورزی سے متعلق تھے۔ ہٹلر نے حکومت برطانیہ کے مراسلہ کو ردی کی ٹوکری کے حوالہ کر دیا۔

اقتصادی کساد بازاری

۱۹۳۲ء میں دنیا کے دیگر ممالک کی طرح فرانس بھی عالمگیر اقتصادی کساد بازاری کے دام میں پھنس گیا۔ ملوکیت کے حامیوں اور فاسطیوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر جمہوریت پسند اور اشتراکیت پسند عناصر کو سیاست کے میدان میں شکست دینی شروع کی اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ یورپ کے دوسرے ممالک میں فاسطیت زور و شور سے ترقی کر رہی تھی۔ فرانس کے ملوکیت پسند اور فاسطی عناصر کو قدرتاً اس صورت حال سے اور زیادہ تقویت پہنچی۔ دوسری بات یہ تھی کہ جمہوریت پسند اور اشتراکیت پسند گروہوں کی حکومتوں نے گزشتہ چند سالوں میں ملک کے پیچیدہ مسائل کا کوئی حل نہیں پیش کیا اور نہ عوام کو ان بے جا قیود اور بندشوں سے آزاد کرانے میں کوئی کامیابی حاصل کی جو مال دار اور متمول طبقات نے ان پر عاید کر رکھے تھے۔ ایک مزید وجہ یہ ہوئی کہ جمہوریت پسند اور اشتراکیت پسند گروہوں کی حکومت کے زمانہ میں فرانس کے مالی حلقوں میں فریب کاری، جعل سازی اور بے ایمانی کے کئی ایسے واقعات پیش آئے جن سے ان کی حکومت کی بڑی بدنامی ہوئی۔ ان میں سے ایک واقعہ جس میں اسٹاوسکی نامی ایک شخص شریک تھا جو اتنا زبردست تھا کہ اس پر سارے ملک میں ایک عام ہیجان برپا ہو گیا اور فرانس کے ملوکیت پسندوں اور فاسطیوں نے اس واقعہ کی بنا پر جمہوریت اور اشتراکیت پسندوں پر یہ الزام لگایا کہ وہ بھی ان دھوکا بازوں اور ٹھگوں کی کارروائیوں میں شریک تھے۔ انگلستان کے کئی اخبارات نے جو متمول طبقات کے نمائندے تھے، فرانس کی حالت زار کا نقشہ کھینچتے ہوئے اس ملک کی تجارتی اور اقتصادی بے ایمانیوں کا رونا رویا اور بتایا کہ فرانس کی تجارتی اور اقتصادی زندگی میں ایمان داری، سچائی اور اصول پسندی کا بالکل خاتمہ ہو گیا ہے۔

اسٹاوسکی کون تھا اور اس نے فرانس میں کیا کیا گل کھلائے، اس کا حال ہمیں ایک تقریر سے معلوم ہوگا جو ایک فرانسیسی سوشلسٹ لینگر نیج نے ۱۹۳۴ء میں کی تھی۔ اس تقریر کا ایک اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ اسٹاوسکی کو ناچ گھروں اور گھوڑ دوڑ کے مشاغل سے خاص شغف تھا، اس زمانہ میں وہ ایک نہایت عالیشان موسیقی گھر چلا رہا تھا۔ لیکن اسے گروی (رہن) کے کاروبار سے بھی خاصی دلچسپی تھی۔ ۱۹۳۰ء میں وہ آرلینس کے شہر گیا اور وہاں اس نے چند زمرد رہن رکھائے، اب یہ نہیں معلوم کہ زمرد اصلی تھے یا نقلی۔ بہر حال اسے لکھو کھا روپیہ وصول ہوا۔ چند ہی روز بعد اس کی کئی ایک شکایات پیش ہوئیں اور سارے شہر میں بڑا ہیجان پیدا ہوگیا۔ حکومت نے فوراً تحقیقات کا حکم دیا۔ ان تحقیقات کا نتیجہ کیا ہوا کوئی نہیں جانتا۔ لیکن اسٹاوسکی نے شکایت کنندوں کو روپیہ واپس کر کے بیون کی راہ لی اور وہاں رہن اور گروی کا کاروبار شروع کر کے ایک دکان چلانی شروع کی۔ اس کاروبار سے اسے اتنا مالی فائدہ حاصل ہوا کہ وہ ایک کمپنی کا ناظم ہوگیا۔ اس کے علاوہ کئی روزناموں اور ہفتہ وار اخبارات کا مالک بن بیٹھا اور اس نے کئی ایک تھیٹر بھی کھولے۔ غرض کہ اب وہ سچ مچ پیرس کا بادشاہ تھا، اس کے تعلقات بہت وسیع تھے اور متعدد اشخاص جو بڑے بااثر اور صاحب رسوخ تھے اس کے گہرے دوستوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ یہ لوگ اسٹاوسکی کے ذریعے مختلف کمپنیوں کی مجلس نظما کے رکن بننے کی کوشش میں مصروف تھے۔ اگر وہ اپنے جعلی ہنگروی تمسکات جن کی قیمت ۱۵ ارب فرانک تھی، بازار میں فروخت کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو یہ تھوکا فضیحتی نہ ہوتی بلکہ ملک میں ایک معاشی اور اقتصادی ہیجان برپا ہو جاتا لیکن اس کی تمام تدابیر ناکام ہوگئیں اور اس کے بہت سے ساتھی گرفتار کر لیے گئے۔ پولیس کے بیان کے مطابق خود اسٹاوسکی نے خودکشی کر کے جان دی۔

اب میں سوال کرتا ہوں کہ ایک ایسا بدنام شخص جس کو ۱۹۲۷ء میں مشروط طور پر رہا کیا گیا تھا اور ایک جواری جسے پولیس نے مجرموں کی فہرست میں داخل کیا تھا اور جس کو تمام ناچ گھروں میں داخل ہونے سے حکماً منع کر دیا گیا تھا کس طرح اتنے دنوں تک آزادی

کے ساتھ دغا اور فریب کے ذریعے پبلک کو لوٹ کھسوٹ کر لاکھوں کروڑوں روپیہ پیدا کرتا رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہمارے محکمہ پولیس، ہماری عدالتوں، ہمارے سرکاری اور کاروباری دفاتر، ہمارے اخبارات اور ہماری پارلیمنٹ میں اس کو حریص اور طامع افراد کی ایک کثیر تعداد مل گئی جنھوں نے اس کی حرکات سے چشم پوشی کی۔

پھر سوال یہ ہے کہ پولیس نے اس کے خلاف بروقت کارروائی کیوں نہیں کی جب کہ وہ اس کی فریب کاریوں سے بخوبی واقف تھی۔ سرکاری ممانعت کے باوجود اسے ناچ گھروں میں داخلہ کی اجازت کس نے دی۔ یاد رہے کہ ۱۹۲۷ء میں عارضی طور پر رہائی ملنے کے بعد اسٹاوسکی بیون گیا۔ یہاں اسے ہر طرف شبہ کی نظروں سے دیکھا گیا۔ پولیس اس کے تعاقب میں تھی۔ لیکن اتنے طویل عرصے میں بھی اس کی کوئی گرفت نہیں کی گئی۔ پھر اس نے میونسپلٹی کے قرضوں کا دھندہ شروع کیا لیکن اس جعل سازی پر کسی نے توجہ نہیں کی حالانکہ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ خفیہ پولیس اس کے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ بیارٹز میں اس نے کروڑہا روپیہ کا جوا کھیلا، یہاں وہ بڑے کروفر سے رہتا تھا حالانکہ نہ کسی شخص کو اس کا پتہ معلوم تھا اور نہ اس کا ذریعہ آمدنی۔ ۱۹۲۹ء میں نے ایک سابقہ پولیس افسر، ایک فوجی جنرل اور ایک پنشن یافتہ سرکاری عہدے دار کے ساجھے میں ایک کمپنی قائم کی۔ ۱۹۳۳ء میں اس نے ایک اور کمپنی قائم کی جس کے نظما میں سے فرانس کا ایک سابقہ وزیر خارجہ بھی تھا۔ محکمہ پولیس اور محکمہ فنانس اس وقت کیا کر رہے تھے۔ اب ہمیں اخبارات کے ذریعے معلوم ہوتا ہے کہ پولیس کے ایک بڑے عہدے دار نے اس کے متعلق تفصیلی رپورٹیں تیار کی تھیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ حکومت نے ان رپورٹوں پر کارروائی کیوں نہیں کی۔ پھر جب آخری وقت میں اسٹاوسکی کی گرفتاری ناگزیر ہوگئی تو وہ پولیس کی گرفت سے بچ نکلنے میں کیوں کر کامیاب ہوگیا۔ اس غفلت کا ذمہ دار کون ہے؟

فرانس کا ذہنی اور اخلاقی انحطاط

فرانس کے ذہنی اور اخلاقی انحطاط کا اس کی فوجی شکست میں کتنا دخل تھا۔ اس کا حال ہمیں پروفیسر تمیر کی کتاب سے معلوم ہوتا ہے، ذیل میں ہم پروفیسر تمیر کی کتاب کے چند

اقتباسات درج کرتے ہیں:

ہٹلر نے معاہدہ ورسائی کے بالکل برخلاف جب رہائن لینڈ پر قبضہ کر لیا تو فرانس کے ارباب حل وعقد نے جرمنی کے اس اقدام پر کوئی فوجی کارروائی نہیں کی حالانکہ یہ فرانس کے خلاف سب سے بڑا مہلک قدم تھا جو ہٹلر اٹھا سکتا تھا۔ فرانسیسی قوم کی اس بے عملی کی وجوہات بیان کرتے ہوئے ایم فلانڈن جو ۳۴ء اور ۳۵ء کے درمیان وزیر اعظم رہ چکا تھا لکھتا ہے کہ فوج کی مجلس اعلیٰ کا ایک اجلاس چند ہی روز بعد منعقد ہوا، وزرائے فوج اور ان کے مشیر خاموش تھے اور جب میں نے ان سے دریافت کیا کہ فوری طور پر کیا فوجی کارروائی کی جا سکتی ہے تو وزیر حرب نے بیان دیا کہ فرانسیسی فوج کو دفاعی اصولوں پر تربیت دی گئی ہے اور جس پیمانہ پر میں نے فوجی مداخلت تجویز کی تھی اس کی پہلے سے کوئی تیاری نہیں کی گئی ہے۔

فرانس کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ تھا جب کہ ایک وزیر خارجہ نے جنگی کارروائی کا مشورہ دیا اور وزرائے فوج جنگ کے لیے تیار نہ تھے۔

رہائن لینڈ پر ہٹلر کی فوج کشی کے بعد پیرس میں فرانسیسی کابینہ کا جو اجلاس ہوا اس کا حال فلانڈن نے حسب ذیل الفاظ میں لکھا ہے: ''کابینہ پر ایک ذہنی انتشار طاری تھا، میں نے حالات بیان کیے اور یہ بھی کہا کہ میں مجلس اقوام کے سیکرٹری کو اس واقعہ کی اطلاع دے چکا ہوں۔ لوکارنو کے معاہدہ کی ایک شرط یہ تھی کہ مجلس اقوام کی کونسل کو اس امر کے فیصلہ کا اختیار ہوگا کہ کون سا عمل معاہدہ شکنی کی تعریف میں آتا ہے اور مجھے معلوم ہے کہ لندن میں اس شرط پر عمل درآمد کو ضروری تصور کیا جاتا ہے۔ میں نے دریافت کیا کہ کس قسم کی فوجی کارروائی کرنی مناسب ہوگی اور یہ کارروائی کب عمل میں آئے گی۔ اگرچہ میں نے یہ بھی بتا دیا کہ برطانوی حکومت کو اصرار ہے کہ معاہدہ لوکارنو کی ضامن حکومتوں کے تصفیہ سے پہلے کوئی کارروائی عمل میں نہیں آنی چاہیے۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب وزیر جنگ نے بتایا کہ صرف میجنو لائن پر مدافعین کو تعینات کر دینا اور وادی رہون سے مشرقی سرحد کی جانب دو ڈویژن فوج منتقل کر دینا کافی ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ جنرل اسٹاف کا مطالبہ ہے کہ

رہائن لینڈ پر فوجی کارروائی کی صورت میں پہلے افواج کا اجتماع عام عمل میں لایا جائے۔ اس بیان سے کابینہ میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ وزیروں نے کہا کہ انتخابات سے چھ ہفتہ قبل افواج کا اجتماع عام ناممکن العمل ہے۔ آخر میں صرف چار وزیر جن میں ایک میں خود تھا فوجی کارروائی کے حق میں تھے۔ باقی کابینہ کا فیصلہ یہ تھا کہ ملک کے اندر اور باہر رائے عامہ کا ردعمل معلوم کرنے کے بعد کوئی قدم اٹھایا جائے۔

ایم مسرات نے ایک نشری تقریر کے ذریعے فرانس کی رائے عامہ بیدار کرنے کی کوشش کی۔ اس نے کہا کہ ہم اسٹراسبرگ ۵ کو جرمن توپوں کی زد میں دیکھنا نہیں چاہتے۔ لیکن اس تقریر کا رائے عامہ پر کوئی اثر نہ ہو۔ ایم فلانڈن اس پر رائے زنی کرتے ہوئے لکھتا ہے "یقیناً فرانس کا قومی احساس مرچکا ہے۔"

۱۶ مارچ کو معاہدہ لوکارنو کے ضامنوں کی ایک کانفرنس پیرس میں منعقد ہوئی۔ چوں کہ برطانوی وفد کو اپنی حکومت کی طرف سے محدود اختیارات ملے تھے، اس لیے ایم فلانڈن نے حکومت فرانس پر زور دیا کہ وہ اس مسئلہ کا خود کوئی تصفیہ کرے۔ اس نے فرانسیسی حکومت کو متنبہ کیا کہ گفت وشنید کے اس دلدل میں اپنے آپ کو پھنسائے رکھنے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ معاہدہ لوکارنو کے تحت فرانس کو اختیار ہے کہ اس معاہدہ کی فوجی دفعات کی خلاف ورزی کا ثبوت مہیا ہونے پر بلکہ اس سے پہلے ہی وہ جو قدم چاہے اٹھا سکتا ہے۔ بہرحال اس میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ احتیاط کے طور پر افوج کا اجتماع عام عمل میں لایا جائے۔ اگرچہ یہ اقدام بھی اب بیکار معلوم ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ انگلستان اور بلجیم ہماری کارروائی سے اتفاق نہیں کریں گے۔ کابینہ کو اس پر غور کرنا چاہیے کہ آیا فرانس کے موجودہ اور آئندہ مفاد کی خاطر انگلستان سے طول طویل گفت وشنید کرنے کا خطرہ مول لینا مناسب ہوگا یا انگریزوں کی مخالفت کی پروا کیے بغیر کارروائی کا آغاز کر دینا زیادہ بہتر ہوگا۔ جہاں تک میری رائے کا تعلق ہے، میں تو یہی کہوں گا کہ جرمن افواج کے خلاف مزاحمتی کارروائی شروع کر دینی بہتر ہے۔ ایک مرتبہ پھر وزرائے فوج نے اپنی

مشکلات کا رونا رویا اور متذبذب ارکین کابینہ نے شکوک وشبہات کا اظہار کیا۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ جب برطانیہ جرمنوں سے رہائن لینڈ کے تخلیہ کی بابت گفت وشنید کرنے پر تیار ہے تو خواہ مخواہ فوجی کارروائی کر کے جنگ کا خطرہ مول لینے سے کیا فائدہ ہوگا۔ اس پر پال بینکور اظہار رائے کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''ہمیں انگلستان، بلجیم یا مجلس اقوام سے استمزاج کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی بلکہ پہلے فوجی کارروائی کا آغاز کر دینا چاہیے تھا۔ ایسا قدم اٹھا لینے اور معاہدہ کی خلاف ورزی کا موثر جواب دینے کے بعد ہمیں مجلس اقوام کی طرف رجوع کرنا چاہیے تھا بشرطیکہ کوئی اور حکومت اس کے سامنے یہ معاملہ اٹھاتی''۔

فرانس کے اسباب شکست کی توجیہہ کرتے ہوئے وزیر اعظم ایم رینو لکھتا ہے:

''۱۹۱۸ء کے بعد فرانس میں فتح کے نہیں موت کے آثار نمایاں تھے۔ گزشتہ صدی کے آخری حصہ سے قوم میں ایک اخلاقی زوال کی ابتدا ہو چکی تھی۔ فرانس امن اور صلح کا خواہش مند تھا لیکن اس نے وہ ذرائع اور وسائل مہیا نہیں کیے جن سے امن کی ضمانت ہو سکتی۔ معاہدہ لوکارنو بزدل لیڈروں کا سودا تھا۔ اس میں میونخ کا رنگ نظر آتا ہے۔ اس کے بعد ہٹلر کا عروج اور فرانس کا تدریجی زوال شروع ہوا۔ قوم میں ایک طرح کی سستی اور کاہلی پیدا ہوگئی اور یہ تخیل دماغوں میں بس گیا کہ میجنو لائن کی آڑ میں بیٹھ کر فرانس کامیاب طور سے اپنی مدافعت کر سکتا ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر ایک شدید قسم کی امن پسندی کا دور دورہ شروع ہوا جس کے مبلغین یہاں تک کہنے لگے کہ غلامی جنگ سے بہتر ہے۔ لوگوں کی حب الوطنی اس شرط کے ساتھ مشروط ہوگئی کہ ان کی پارٹی برسر اقتدار رہو۔ باہمی رشک وحسد اتنا بڑھا کہ بعض لوگ یہ کہتے نظر آنے لگے کہ بلم کے مقابلہ میں ہم ہٹلر کی حکومت کو ترجیح دیں گے۔ اس اخلاقی زوال اور فوجی کمزوری گہرا تعلق تھا''۔

آگے چل کر ایم رینو لکھتا ہے:

کسی فوج سے یہ کہنا کہ تم صرف محفوظ قلعہ بندیوں کی آڑ میں لڑ سکتے ہو، اس کی جرات وہمت کو فنا کر دینے کے مترادف ہے۔ فرانس کو صرف دفاعی فوج سے آراستہ کرنا زمانہ مابعد جنگ میں ہمارے اخلاقی اور ذہنی انحطاط کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

جون ۱۹۳۶ء میں فرانس کی وزارت عظمیٰ کا جائزہ لینے کے بعد بلم نے فوج کے ارباب حل وعقد سے فرانسیسی افواج کی حالت کے بارے میں سوال کیا۔ پیتان نے جواب دیا کہ فرانسیسی فوج پوری طرح تیار ہے اور دنیا کی بڑی سے بڑی فوج کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ ۴ جولائی کو جنرل دیگان نے بتایا:

''آپ پوچھتے ہیں کہ فرانسیسی فوج کی کیا حالت ہے۔ میں آپ سے صاف صاف کہوں گا اور صرف سچائی کو مدنظر رکھوں گا۔ میرا یقین ہے کہ فرانسیسی فوج اپنی پوری تاریخ میں اس سے زیادہ بہتر حالت میں کبھی نہ تھی۔ اس کے اسلحہ اعلیٰ ترین قسم کے ہیں۔ اس کی قلعہ بندیاں نہایت مضبوط، اس کی جرات وہمت بے مثال اور اس کی قیادت دانش مندانہ ہے ہم میں سے کسی کو جنگ کی آرزو نہیں ہے لیکن اگر جنگ چھڑ جائے تو میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ فتح ہماری ہوگی۔''

ہٹلر کی جرات مندانہ اور پرعزم سیاست کے مقابلہ میں فرانس کا کیا طرز عمل تھا۔ اس کا حال لکھتے ہوئے ایک مصنف کہتا ہے:

۳۱ اگست کو جب کہ روس اور جرمنی کے باہمی معاہدہ کی تکمیل قریب الوقوع تھی ایم بانٹ وزیر خانہ نے قومی مجلس دفاع سے حسب ذیل سوال کیا:

کیا یہ ضروری ہے کہ ہم نے پولینڈ سے جو معاہدہ کیا ہے اس پر دیکھے سنے بغیر پوری طرح عمل درآمد کرنے پر تیار ہو جائیں۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم پولش حکومت پر دباؤ ڈال کر اسے ہٹلر کے ساتھ صلح کرنے پر مجبور کریں۔ اس سے ہمیں کچھ مزید مہلت مل جائے گی جس میں ہم اپنے اسلحہ اور ساز وسامان کی تعداد بڑھا سکیں گے، اپنی فوجی قوت کو مضبوط اور سیاسی حالت کو درست کر سکیں گے تاکہ کچھ مدت کے بعد ہم جرمنی کا زیادہ موثر طور سے مقابلہ کر

سکیں۔ لیکن اس میں یہ خطرہ بھی ہے کہ اس وقت مصالحت کر لینے سے فرانس اور پولینڈ کا معاہدہ کمزور پڑ جائے گا جس کو فرانس کی حفاظت اور مدافعت کے لیے ضروری خیال کیا جاتا ہے، کیا فرانسیسی جنرل اسٹاف اس معاہدہ کو اب بھی ویسا ہی ضروری خیال کرتا ہے۔

بانٹ کی مصالحت پسندانہ روش کامیاب نہ ہو سکی کیوں کہ پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ جنرل گیملن نے بتایا کہ اگر پولینڈ کو اس طرح ہٹلر کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا تو وہ اس ملک کو چند روز کے اندر ختم کر کے اپنی پوری فوج فرانس کی سرحدوں پر جمع کر دے گا اور اس وقت فرانس اس کی طاقت کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ ہو گا۔ جب ۱۳ اگست کو مسولینی نے پولینڈ اور جرمنی کے درمیان بیچ بچاؤ کرنے کی پیش کش کی تو بانٹ نے بڑی مسرت کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا۔ لیکن برطانیہ اور پولینڈ کو اصرار تھا کہ مصالحت کی گفت و شنید سے قبل جرمنی کو اپنی افواج پولینڈ سے واپس بلانی چاہییں، اس لیے بانٹ کو اطالوی بیچ بچاؤ سے فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں ملا۔

۲ ستمبر ۱۹۳۹ء تک یہ بات ظاہر ہو گئی کہ برطانوی حکومت جرمنی کے خلاف فوری کارروائی کا مطالبہ کر رہی تھی جبکہ فرانس کی حکومت لیت و لعل کر رہی تھی۔ ایم بانٹ نے پہلے دستوری مشکلات کا عذر کیا، اس نے بتایا کہ جرمنی کو الٹی میٹم دینے کے لیے فرانسیسی پارلیمنٹ کا ووٹ حاصل کرنا ضروری ہے۔ اس کے بعد یہ عذر پیش کیا کہ میں اطالوی وزیر خارجہ کاؤنٹ کیانو سے ۲ ستمبر تک انتظار کرنے کا وعدہ کر چکا ہوں۔ اس درمیان میں اس نے سرحدی علاقوں سے عورتوں اور بچوں کے تخلیہ کا ذکر کرنا شروع کیا۔ فرانسیسی فوج بھی مصر تھی کہ اسے کچھ مزید وقت دیا جائے تاکہ وہ اپنے انتظامات مکمل طور پر ٹھیک کر لے۔ برطانوی حکومت نے اسی روز جب کہ جرمن فوجوں نے پولینڈ پر حملہ کیا، یہ تجویز کی کہ برطانوی اور فرانسیسی سفیر جرمنی سے واپس بلا لیے جائیں۔ اس نے ۲ ستمبر کو پونے پانچ بجے شام کے وقت بانٹ کو اطلاع دی کہ وہ ہٹلر کو آدھی رات تک پولینڈ سے فوجیں واپس بلا لینے کا موقع دے گی اور اگر اس کے بعد بھی ہٹلر نے اپنی فوجوں کا تخلیہ نہ کیا تو وہ جنگی کارروائی کا آغاز کر

دے گی۔ اس کے باوجود فرانسیسی کابینہ کا فیصلہ یہی تھا کہ دوسرے روز تک جرمنی کو الٹی میٹم نہ دیا جائے۔ چنانچہ چیمبرلین کو پونے دس بجے رات فرانس کے اس فیصلہ کی اطلاع دی گئی۔

ایم بادون فرانس کی فوجی حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

میں نے جنرل ویگان سے کہا کہ فرانس میں صرف مادی اور فوجی وسائل کی کمی نہیں بلکہ روحانی قوت کا بھی فقدان ہے۔ اس ملک میں اخلاقی طاقتوں کو شکست ہو چکی ہے۔ فرانسیسی نوجوانوں کو کسی ایسے عقیدہ کی تعلیم نہیں دی گئی جس کے لیے ان کے دلوں میں جان و مال کی قربانی کا جذبہ پیدا ہو سکے۔ اگر ملک کو بچانا ہے تو تعمیر نو کا کام جلد شروع ہونا چاہیے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ میں ہر طرف شک، تذبذب اور عقاید کی کمزوری کے آثار دیکھ رہا ہوں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ فرانس کے نظم و نسق پر ایک نااہل حکمران طبقہ حاوی ہو گیا ہے جس کو اپنے مفاد کے آگے قوم یا ملک سے کوئی محبت نہیں ہے۔ مجھے یقین نہیں کہ اہل ملک اور اہل فوج میں اتنی جرات و ہمت باقی ہے کہ وہ کسی حالت میں بھی جرمنوں کی اطاعت کا خیال نہ کریں۔

مئی ۱۹۴۰ء میں جب کہ فرانس کی فوجی شکست قریب تھی تو پندرہ فوجی جنرلوں کو ان کی خدمت سے علیحدہ کر دیا گیا۔ جنرل ویگان کو اس کارروائی سے پورا پورا اتفاق نہیں تھا۔ اس کی رائے یہ تھی کہ فرانس کی شکست کے بانی مبانی فوجی لیڈر نہیں ہیں۔ اس نے ایک بیان میں بتایا کہ جو کچھ ہمیں اس وقت بھگتنا پڑ رہا ہے، وہ گزشتہ بیس سال کی غلطیوں اور غفلتوں کا نتیجہ ہے۔ یہ بڑی بے انصافی ہوگی اگر ہم صرف فوجی جنرلوں کو خطاوار قرار دے کر انھیں سزا کے طور پر ان کی خدمات سے برطرف کر دیں اور ان استادوں اور معلموں کو بری الذمہ کر دیں جنھوں نے قوم کے بچوں اور نوجوانوں کو حب الوطنی اور ایثار و جفاکشی کی تعلیم نہیں دی۔

فریڈرک شومین نے اپنی کتاب کے چوتھے حصہ میں فرانس کی شکست کے اسباب پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

''بڑی بڑی قوموں کو بیرونی حملہ آوروں کے ہاتھوں شکست کا مزہ اسی صورت میں چکھنا پڑتا ہے جب کہ پہلے وہ خود اپنے باہمی اختلافات اور جھگڑوں کی وجہ سے اندرونی طور

پر شکست کھا چکی ہوں۔ نپولین کی عظیم الشان فتوحات میں اس کی بے نظیر فوجی مہارت کے علاوہ ایک بڑا عنصر یہ بھی تھا کہ براعظم یورپ کی سلطنتیں اندرونی انتشار میں مبتلا تھیں جو کہ طبقاتی اختلافات سے پیدا ہوا تھا۔ ہٹلر کی جارحانہ کارروائیاں بھی اسی باعث کامیاب ہوئیں کہ اس کی مفتوحہ اقوام شدید اندرونی اختلافات کی وجہ سے کمزور ہوگئی تھیں۔
جمہوریت کے زوال کے ابتدائی دور میں ہر ملک کے سرمایہ دار اور متمول افراد فاسسطی تحریک کو پسندیدہ نظروں سے دیکھتے تھے کیوں کہ ان کے دل میں یہ غلط خیال جم گیا تھا کہ یہ تحریک ادنیٰ طبقوں کی کامیاب بغاوت اور انقلاب سے ان کی حفاظت کرے گی۔ اس کے برخلاف بہت سے مزدوروں، بعض کسانوں اور چھوٹے چھوٹے دکان داروں کو یہ شبہ تھا کہ متمول طبقات کی نمائندگی کرنے والے سیاست دانوں اور حکمرانوں کو روم اور برلن کی استبدادیت سے گہری ہمدردی ہے اور یہ لوگ قومی مفاد کو طبقاتی اغراض پر قربان کر دینے کے لیے تیار ہیں۔ حالانکہ اگر یہ اپنے طبقاتی اغراض کو بھی ذرا وسعت نظر سے دیکھتے تو انھیں اپنی حماقت کا احساس ہو جاتا، یہ شبہات حق بجانب تھے۔ سرمایہ دار ممالک میں خوشحال طبقوں کے افراد آرام کی زندگی گزار رہے تھے لیکن انھیں یہ خطرہ تھا کہ معاشی کساد بازاری، انقلابی تحریکات اور جنگ وجدال کی وجہ سے ان کی خصوصی مراعات کا خاتمہ ہو جائے گا جن پر ان کا تفوق مبنی تھا۔ اس لیے یہ لوگ خفیہ طور پر آمروں کی استبدادی حکومتوں سے ہمدردی رکھتے تھے کیوں کہ ان حکومتوں نے مزدور طبقہ کو بالکل دبا دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جمہوری ممالک میں امن پسندی اور ڈکٹیٹروں کے ساتھ مصالحانہ رجحان پیدا ہوگیا اور جمہوری حکومتیں فاسسطی لیڈروں کے جارحانہ عزائم سے قصداً چشم پوشی کرنے لگیں۔ یہ حماقت یہاں تک بڑھی کہ فاسسطی ملکوں کی طاقت ان کے لیے خطرہ کا باعث بن گئی اور انھوں نے اپنی تباہی کا سامان خود پیدا کر لیا۔ جو حکمران طبقہ زوال پذیر ہو جاتا ہے وہ بسا اوقات دشمنوں کو اپنا محافظ خیال کرنے لگتا ہے۔ جرمنی، اطالیہ اور جاپان کے مال دار اور سرمایہ دار طبقوں نے اپنی قیمتیں ایک فوجی جماعت کے ہاتھ میں اس مغالطہ کے تحت دے دیں کہ وہ اسے

اپنے قابو میں رکھ کر اس سے اپنے مفاد کی خدمت کا کام لیں گے۔ اس طرح انھوں نے اپنا سیاسی اقتدار خود ہی دوسروں کے حوالے کر دیا۔ اس صورت حال سے سبق لینے کے بجائے فرانس، برطانیہ اور دوسرے ملکوں کے متمول طبقات نے بھی فاسسٹی ڈکٹیٹروں کے مقابلہ میں کچھ اسی قسم کا طرز عمل اختیار کیا۔ چنانچہ انھیں بھی وہی نتیجہ بھگتنا پڑا۔

جرمنی اور اطالیہ کے جارحانہ عزائم کے مقابلہ میں فرانس کے ارباب اقتدار کا رویہ کیا تھا، اس کا حال بیان کرتے ہوئے شو میں لکھتا ہے:

لاوال فرانسیسی روسی معاہدہ کی توثیق کو برابر ٹالتا رہا یہاں تک کہ آسٹریا پر جرمن قبضہ نے بالآخر اسے اس کارروائی کی تکمیل پر مجبور کر دیا، باوجود اس امر کے کہ فرانس روس سے معاہدہ کر چکا تھا لاوال کی صدارت میں فرانسیسی حکومت نے جرمنی سے مقابلہ کرنے کے لیے روس کے بجائے اطالیہ اور انگلستان کو راضی کرنا شروع کیا۔ انگریزوں کو خوش کرنے کے لیے جن کی پالیسی یہ تھی کہ یورپ کے امن میں خلل نہ پڑنے پائے، لاوال نے جرمن اسلحہ بندی سے دیدہ و دانستہ چشم پوشی کر لی اور اطالیہ کے خلاف تدارکات منظور کروانے میں انگریزوں کی پوری پوری حماقت کی۔ ادھر اطالیہ کو خوش کرنے اور بحیرہ روم میں جنگ کے خطرہ سے محفوظ رہنے کے لیے اس نے حبشہ کے خلاف اطالوی عزائم کو خندہ پیشانی سے گوارا کر لیا اور مجلس اقوام نے اجتماعی تحفظ کا جو نظام قائم کیا تھا اسے درہم برہم کرنے کی درپردہ کامیاب کوشش کی۔ اس طرح فرانس نے انگریزوں اور اطالویوں کو بیک وقت راضی کرنے کی جدوجہد میں دونوں کی ناراضگی مول لی۔ روم اور لندن میں فرانسیسی حکومت کے خلاف ناراضگی پھیل گئی۔ برلن کی طاقت میں مزید اضافہ ہوگیا اور فرانسیسی وقار کو سخت صدمہ پہنچا، ۷ مارچ ۱۹۳۷ء کو جب ہٹلر نے معاہدہ لوکارنو کی خلاف ورزی کر کے رہائن لینڈ میں مسلح جرمن فوجیں متعین کر دیں تو فرانسیسی جنرل اسٹاف نے محسوس کیا کہ اگر جرمنی رہائن لینڈ کی سرحد کو قلعہ بند کرنے میں کامیاب ہو گیا تو جرمنی سے جنگ کی صورت میں روس یا چکیوسلواکیہ کو بموجب معاہدہ امداد پہنچانا ناممکن ہو جائے گا۔ اس نے تجویز کی کہ

فرانس کو فوراً رہائن لینڈ پر قبضہ کر لینا چاہیے لیکن اس اقدام سے پہلے فوجوں کا اجتماع عام ضروری تھا۔ اس کے علاوہ چوں کہ اس عمل سے جنگ کا خطرہ تھا، اس لیے انگلستان اور فرانس کے تعلقات میں بدمزگی بھی پیدا ہو جانی ضروری تھی۔ جنرل گیملن نے رہائن لینڈ پر قبضہ کر لینے کی تجویز پر اصرار نہیں کیا۔ اس لیے سرات کی کابینہ نے کوئی فوجی کارروائی نہیں کی بلکہ صرف لفظی احتجاج اور رسمی سوال و جواب پر اکتفا کیا۔ بلم کی کابینہ نے بھی اس توقع پر یہی پالیسی جاری رکھی کہ رہائن لینڈ میں کوئی کارروائی نہ کرنے اور حبشہ کو اطالیہ کے مقابلہ میں تن تنہا چھوڑ دینے کی برطانوی تجویز کی حمایت کرنے سے جرمنی کے خلاف فرانسیسی برطانوی، اطالوی، اتحاد اور زیادہ مضبوط ہو جائے گا۔ لیکن یہ امید بھی نقش بر آب ثابت ہوئی۔ برطانیہ نے وسطی یورپ کی ریاستوں کے بارے میں کسی ذمہ داری کو قبول کرنا پسند نہیں کیا اور مسولینی نے فوراً ہٹلر سے سمجھوتہ کر لیا۔

(ب) انگلستان

انگریزوں کی طاقت کا زوال ۱۹۱۳ء کی جنگ کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ اس جنگ سے پہلے انگریزوں کے ملک میں معاشی انتشار اور بدنظمی کے آثار و علامات ناپید تھے اور ان کی سلطنت کبھی اتنے پیچیدہ مسائل سے دوچار نہیں ہوئی تھی۔ ۱۹۱۸ء کے بعد سے انگریزوں کو اپنے ملک اور بیرونی نو آبادیات میں جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا وہ زیادہ تر جنگ عظیم کی پیدا کردہ تھیں۔ اس نقطہ نظر سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب انگلستان کا داخلی ہیجان اور اس کی نو آبادیات کا باغیانہ رجحان جنگ کا نتیجہ تھا، تو انگریزوں کے زوال میں ان کے اپنے اعمال کا کیا دخل ہے۔ اگر وہ سیاسی بے ایمانیاں، معاشی مظالم اور طبقاتی ناانصافیاں نہ بھی کرتے تب بھی انھیں جنگ عظیم کی بدولت انھی مسائل کا سامنا کرنا پڑتا۔ اس دلیل کا جواب یہ ہے کہ خود جنگ عظیم زیادہ تر انگریزوں کی غیر ایماندارانہ سیاست اور نو آبادیاتی توسیع کی وجہ سے واقع ہوئی۔ اس لیے یہ جنگ انگریزوں کے سابقہ اعمال کا نتیجہ تھی اور اس

کی وجہ سے انھیں جو نقصانات اور پریشانیاں اٹھانی پڑیں ان کی ذمہ داری بھی انگریزوں کے غلط طرز سیاست اور ان کے طریق فکر و عمل کے نقائص پر عاید ہوتی ہے۔

جنگ عظیم کے اسباب سے بحث کرتے ہوئے والٹر لینگ سیسم اپنی کتاب میں لکھتا ہے:

معاشی رقابت جنگ عظیم کا تیسرا بنیادی سبب تھی۔ درحقیقت یہ دو عوامل ان تمام حالات کے ذمہ دار تھے جن کا بیان اوپر گزر چکا ہے۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کی ابتدا میں منڈیوں کے حصول، خام پیداوار کی تلاش اور ایسے علاقوں پر قبضہ کی فکر جہاں زاید سرمایہ اور آبادی کو کھپایا جا سکے تمام یورپی ممالک کی سرگرمیوں کا محور و مرکز تھی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ افریقہ کو یورپ کی بڑی بڑی طاقتوں نے باہم تقسیم کر لیا۔ مشرق قریب اور ایشیا کے پسماندہ ممالک میں یورپین طاقتوں کا نفوذ بھی انھی عوامل کے اثر سے واقع ہوا۔ برطانیہ اور جرمنی کی تجارتی رقابت، آسٹریا، ہنگری اور روس کی سیاسی آویزش نیز اطالیہ اور آسٹریا ہنگری کی باہمی عداوت بھی اسی جدید معاشی استعماریت کی پیداوار تھی۔ اسی جدوجہد اور حریفانہ کشمکش نے بالآخر جنگ عظیم کی صورت اختیار کی۔

یہ قصہ بڑا طویل ہے لیکن یہاں اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ ۱۸۸۰ء کے بعد اہل برطانیہ کے دلوں میں یہ خوف بڑھتا ہی گیا کہ عالمی تجارت میں جرمنی ان کے ملک سے بازی لے جائے گا ۱۹۰۰ء اور ۱۹۱۴ء کے درمیان برطانوی ارباب حل و عقد نے جرمنی کے متعلق کئی غیر دانشمندانہ اور غیر محتاط بیانات دیے جن کی تہ میں یہی خوف اور یہی جذبہ رقابت کام کر رہا تھا۔ انگریزوں کے صنعت کار اور کارخانہ دار بھی اسی فکر میں پریشان تھے کہ کہیں جرمنی کی بڑھتی ہوئی تجارت اور پھیلی ہوئی صنعت ان کے لیے نقصان دہ ثابت نہ ہو۔ اس فکر نے انھیں بحری اور تجارتی پروپیگنڈے میں توسیع اور اضافہ پر آمادہ کیا۔ برطانیہ کے لوگوں پر ''ساختہ جرمنی'' کا بھوت اس بری طرح سوار تھا کہ یورپ کے امن و امان کو اس جنون سے خطرہ لاحق ہو گیا۔ اس طرح بلقان میں بڑی بڑی طاقتوں کی معاشی رقابت سے آسٹریا ہنگری، روس اور اطالیہ کے مابین نفرت و عداوت کے جذبات پرورش پاتے رہے۔

جنگ عظیم کا ایک اور سبب یہ تھا کہ بین الاقوامی تعلقات کو قابو میں رکھنے کے لیے کوئی مشینری موجود نہیں تھی۔ اس بین الاقوامی مزاج کا سب سے زیادہ تاریک پہلو یہ تھا کہ حکومتیں ایک دوسرے سے خفیہ معاہدات کر لیتی تھیں اور عوام کے نمائندوں یا پارلیمنٹ کے ارکان کو کانوں کان بھی خبر نہ ہوتی تھی کہ ان کی حکومتوں نے باہم کون سے فوجی اور سیاسی سمجھوتے کر رکھے ہیں ۔ ۳ اگست ۱۹۱۴ء کو ایڈورڈ گرے نے پارلیمنٹ میں علانیہ اس بات کا انکار کیا کہ ایوان عام کی آزادی پر کوئی پابندی یا تحدید ہے، حالانکہ اسی درمیان میں برطانوی حکومت نے فرانس سے کئی اہم معاملات پر خفیہ سمجھوتے کیے۔ یہی خفیہ سیاسی کارروائیاں اور یہی بین الاقوامی لاقانونیت اس صورت حال کی بھی ذمہ دار تھی جس کا ذکر آرتھر پالنسی نے ۱۹۲۷ء میں ایک تقریر کے دوران میں کیا جب کہ اس نے ایوان عام کو مخاطب کرتے ہوتے بتایا کہ جعل سازی، چوری، جھوٹ، رشوت ستانی اور بددیانتی دنیا کے ممالک کے دفاتر خارجہ میں زور وشور سے جاری ہے۔

سیاسی بے ایمانیاں

یورپی اقوام کا سیاسی اخلاق جنگ عظیم کے زمانہ تک کتنا خراب ہو چکا تھا اس کا حال ان خفیہ معاہدات سے ظاہر ہوتا ہے جو مختلف ممالک نے عوام کے علم واطلاع کے بغیر ایک دوسرے سے طے کر لیے تھے۔ جنگ عظیم سے پہلے انگریز اور فرانسیسی اطالیہ کو اپنی طرف کھینچنا چاہتے تھے اور آسٹریا ہنگری اپنی طرف۔ چنانچہ اطالیہ اور آسٹریا ہنگری میں ابھی گفت وشنید ہو رہی تھی کہ فرانس، انگلستان اور روس نے ۲۶ اپریل ۱۹۱۵ء کو بمقام لندن اطالیہ سے ایک خفیہ معاہدہ کر لیا جس کے تحت اطالیہ سے یہ وعدہ کیا گیا کہ اگر وہ متحدین کے ساتھ شریک جنگ ہو تو اس کو ڈالمیشیا ٹریسٹی اور جزائر ڈوڈی کینیز دے دیئے جائیں گے۔ حالانکہ ان علاقوں کی آبادی غیر اطالوی اقوام پر مشتمل تھی اور اطالیہ کو ان پر کوئی اخلاقی حق نہیں پہنچتا تھا۔ یونان کو اپنے ساتھ ملانے کے لیے جو اب تک غیر جانب دار تھا، متحدین نے البانیہ اور ترکی کے بعض علاقوں کو اس کے حوالے کر دینے کا وعدہ کیا اور لطف کی بات یہ تھی کہ ان میں سے کچھ علاقوں کے بارے میں اطالیہ سے پہلے ہی وعدہ کیا جا چکا تھا کہ وہ اس کو

دے دیے جائیں گے۔ اس طرح انگریز، فرانسیسی اور روسی اپنے حلیفوں ہی کو دھوکا دینے کی کوشش کر رہے تھے۔

دوسری عالمگیر جنگ جن اسباب سے وقوع پذیر ہوئی اس میں برطانیہ کی سیاسی غلطیوں اور اخلاقی کمزوریوں کا بڑا حصہ تھا۔ اگر برطانیہ کمزور اقوام کے حقوق کی حفاظت اور مدافعت میں تساہل سے کام نہ لیتا اور ہر بڑھتی ہوئی طاقت کو خوش رکھنے کی کوشش میں چھوٹے چھوٹے ملکوں کے ساتھ ناانصافی نہ کرتا تو دوسری جنگ عظیم کا برپا ہونا دشوار تھا۔ جس کے نتیجہ میں انگلستان زوال وانحطاط کے آخری درجہ پر پہنچ گیا۔ برطانیہ کی غلط اور خودغرضانہ سیاست پر تبصرہ کرتے ہوئے شومین[6] لکھتا ہے:

انگریزی میں ایک مثل ہے کہ واٹرلو کی لڑائی ایٹن کے کھیل کے میدانوں میں جیتی گئی اگر یہ صحیح ہے تو اس میں بھی کلام نہیں کہ سوا سو سال کے بعد اسپین، آسٹریا، چیکوسلاویکیہ، پولینڈ اور فرانس میں ہٹلری افواج کی فتوحات کا سنگ بنیاد ایٹن کے کھیل کے میدانوں میں رکھا گیا۔ برطانیہ کے اعلیٰ طبقات اور متمول خاندانوں کے افراد کی تنگ نظری اور کور چشمی جو پبلک اسکولوں کی پیداوار تھے اس کے بعد از جنگ مصائب کی بانی مبانی تھی نہ کہ برطانوی عوام کی جہالت اور صوبہ واریت۔ فرانس کے برعکس انگلستان میں اشتراکی تحریک کی کوئی منظّم طاقت نہیں تھی جس سے دولت منداشخاص کو خوف ہوتا۔ مزدور پارٹی رمزے میکڈانلڈ کی کنارہ کشی کے بعد سیاسی حیثیت سے کمزور ہو چکی تھی۔ جمہوریت پسند گروہ کا اثر بھی تقریباً صفر کے برابر تھا۔ بیس سال کی اس منحوس مدت میں پریشان دماغ انتخاب کنندوں نے اپنی قسمت قدامت پسند پارٹی کے انتہائی رجعت پرست عناصر کے حوالہ کر دی جو ۱۹۳۱ء کی بدبخت قومی حکومت پر حاوی تھی۔ سیاسی اندھوں کی اس حکومت نے صرف مئی ۱۹۴۰ء میں جب کہ انگریزوں کی کشتی حیات ڈگمگانے لگی دوسرے لیڈروں کے لیے جگہ خالی کی۔

اس سوال کے کئی جواب دیئے جاتے ہیں کہ برطانیہ کے لیڈروں نے گزشتہ واقعات سے کیوں سبق نہیں لیا اور اپنے ملک کو دوبارہ ایک عالمگیر جنگ کے مصائب میں کیوں مبتلا

کر دیا لیکن یہ تمام جوابات سطحی اور ظاہری باتوں پر مبنی ہیں۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ معاہدہ و رسائی کے بعد برطانیہ کے تحفظ کے صرف دو ہی طریقے تھے یا تو وہ توازن قوت کے اصول سے دست بردار ہو کر مجلس اقوام کی پوری پوری حمایت کرتا اور اس کو ایک طاقت ور اور حقیقی مجلس امن بنا دیتا یا اسے اپنی سابقہ پالیسی کے مطابق براعظم یورپ کی کمزور ریاستوں کو طاقت ور سلطنتوں کے مقابلہ میں مدد دینی چاہیے تھی۔ اول الذکر طریقہ کار اختیار کیا جاتا تو برطانیہ کو اپنے سر بڑی وسیع ذمہ داریاں لینی پڑتیں اور یہ عزم کر لینا پڑتا کہ وہ ان ذمہ داریوں سے بہر صورت عہدہ برآ ہو کر رہے گا۔ دوسرا طریق کار اختیار کرنے کی صورت میں برطانیہ کے لیے ضروری ہوتا کہ جرمنی کو دوبارہ فوجی طاقت بڑھانے سے روکنے کے لیے وہ معاہدہ ورسائی کی فوجی دفعات کا لفافہ عمل میں لاتے یا اگر یہ نہ ہوسکتا تو اسے پولینڈ چیکو سلاویکیہ اور فرانس کی پوری پوری حمایت کرنی چاہیے تھی اور محوری طاقتوں کے توسیعی اقدامات کا راستہ مسدود کرنے کے لیے روس سے قرار واقعی سمجھوتہ کرنا چاہیے تھا۔ برطانوی حکومت نے ان دونوں میں سے کوئی طریق کار بھی نہ اختیار کیا۔ اس نے مجلس اقوام کی حمایت تو کی مگر بے دلی سے اور آخر کار محوری طاقتوں کو منانے کی سعی ناکام میں اس مجلس کو بالکل ناکارہ اور بے اثر کر دیا۔ اس نے جرمنی کے جمہوری دور میں فرانس کے مقابلہ پر جرمنوں کی مدد کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ فرانس میں پوانکیر حکمران تھا اور جرمنوں کے ساتھ بڑی سختی سے پیش آ رہا تھا۔ بعد کے زمانہ میں جب فرانس میں بارتھو اور بلم کی حکومتیں برسر اقتدار آئیں تو برطانیہ نے ہٹلر کی تائید کی۔ دوسری طرف برطانوی حکومت نے اپنی حمایت آمیز پالیسی سے روس کی ہمدردیاں کھودیں اور آسٹریا، چیکوسلاویکیہ اور پولینڈ کی مدافعت کے بارے میں اس پر جتنی ذمہ داریاں عاید ہوتی تھیں ان سب سے کنارہ کشی اختیار کی۔

برطانیہ کے اہل الرائے یہ سمجھتے تھے کہ جاپان اور روس مشرق میں اور جرمنی اور روس مغرب میں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا رہیں گے۔ اگر ان طاقتوں میں باہم لڑائی چھڑ جائے تو برطانیہ ان سب سے علیحدہ رہ کر اپنی حفاظت کر سکتا ہے۔ ایسی حالت پیدا ہو

جائے تو اس کے لیے صرف فرانس پر دباؤ ڈالنا ضروری ہوگا تاکہ وہ بلقان میں جرمنی کی راہ نہ روکے اور اپنے طبقاتی حلیفوں کی امداد سے دست کش ہو جائے جو مشرقی یورپ میں جرمنی کے منصوبوں کے مخالف تھے۔ ایک مفروضہ یہ تھا کہ انقلابی کمیونزم سلطنت برطانیہ کی حفاظت اور برطانوی حکمران طبقہ کے وجود کے لیے سب سے خطرناک اور مہلک ہے۔ اگر جرمنی، جاپان اور اطالیہ اس خطرہ کی مدافعت کے لیے تیار ہوں تو برطانیہ کو روس کا مقاطعہ کر کے ہٹلر، مسولینی اور جاپانی حکومت کی حمایت کرنی چاہیے۔ البتہ اس میں یہ خطرہ ضرور تھا کہ اگر محوری طاقتیں روس کو فتح کرنے میں کامیاب ہو گئیں تو وہ سلطنت برطانیہ کو بھی ہضم کر سکتی ہیں۔ لیکن کمیونزم کے پھیلاؤ اور تسلط کے مقابلہ میں یہ خطرہ موہوم تھا۔ ان مصروفیات کی بنا پر برطانیہ نے محوری طاقتوں کی جارحانہ کارروائیوں کو سکوت کے ساتھ برداشت کیا بلکہ حتی الامکان ان طاقتوں کی دلجوئی اور حوصلہ افزائی بھی کرتا رہا۔

اس طرز استدلال کی ایک مثال ہمیں فورٹ نائٹلی ریویو کے ایک مضمون میں ملتی ہے جسے ۱۹۳۴ء میں مسٹر لائن نے سپرد قلم کیا تھا، یہ مضمون نگار لکھتا ہے:

گزشتہ زمانہ کے جرمن سیاست دان مشرق و مغرب دونوں پر للچائی ہوئی نظریں دوڑایا کرتے تھے لیکن ہٹلر اب صرف مشرق سے سروکار رکھنا چاہتا ہے۔ جو شخص بھی مشرقی یورپ کے نقشہ کا گہری نظر سے مطالعہ کرے گا اسے یہ محسوس ہوگا کہ جرمنی اور پولینڈ کی مصالحت میں بڑے بڑے امکانات پوشیدہ ہیں۔ یہ منصوبہ یقیناً نہایت دلکش ہے کہ صوبہ یوکرین کو یورپی نظام میں داخل کر کے روس کو مشرق کی طرف دھکیل دیا جائے۔ اگر یوکرین یورپ کے جمہوری وفاقی نظام کا ایک جزو بن جائے تو سلطنتوں کا ایک ایسا مجموعہ پیدا ہو سکتا ہے جس کے ساتھ برطانیہ کے تعلقات نہایت خوش گوار اور دوستانہ ہوں گے مشرقی یورپ میں اس قسم کے ریاستی نظام کی تشکیل کے لیے موجودہ وقت نہایت سازگار معلوم ہوتا ہے۔

مسٹر ایل ایس ایمری سابق وزیر نو آبادیات نے فارورڈ میں ایک مضمون لکھتے ہوئے یہ رائے ظاہر کی:

''یورپ میں امن وامان قائم رکھنے کے لیے پہلا ضروری امر یہ ہے کہ اب اس بات کو علانیہ طور پر تسلیم کر لیا جائے کہ جرمنی کی اسلحہ بندی اس کا اپنا خانگی معاملہ ہے جس میں کسی اور طاقت کو دخل دینے کی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی ہے۔ وقت آ گیا ہے کہ مجلس اقوام کے دستور پر نظرِ ثانی کی جائے اور ان تمام فقرات اور دفعات پر خط تنسیخ کھینچ دیا جائے جن سے یہ تصور پیدا ہوتا ہے کہ یہ مجلس ایک طرح کی بین الاقوامی حکومت ہے جس کا دائرہ اختیار دوسری حکومتوں پر مافوق ہے۔ یہ خیال مہمل ہے کہ ایک جگہ لڑائی شروع ہو تو دوسرے تمام ممالک اس کی لپیٹ میں ضرور آ جائیں گے۔ ہم اپنے آپ کو ایک یورپی قوم نہیں سمجھتے ہیں، اگر جاپان سائبیریا میں مداخلت کرے یا روس کے کسی حصہ پر قابض ہو جائے تو ہمیں انگلی اٹھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔

مارکوئس آف لنڈنری جو ایک بڑا انگریز جاگیردار اور کئی زرخیز کانوں کا مالک تھا اپنی کتاب شائع شدہ ۱۹۳۸ء میں لکھتا ہے:

ہمارا دفتر خارجہ اس حقیقت کو نظر انداز کر رہا ہے کہ فرانس کی دوستی کی وجہ سے ہم بالواسطہ کمیونزم اور بالشوزم کو تقویت دے رہے ہیں اور جرمنی، اطالیہ اور جاپان کے صحیح تر رویہ کو جو کمیونزم سے عداوت کی پالیسی پر مبنی ہے ہم مسلسل ٹھکرا رہے ہیں۔ بالشوزم ایک عالمگیر عقیدہ ہے جو ہر ملک کے اندرونی نظام کو تہ و بالا کر کے ایک عام حکومت بنانا چاہتا ہے۔ ہمارے ملک میں اس حقیقت سے روگردانی کی جا رہی ہے کہ جرمنی اطالیہ، جاپان اس عقیدہ کے سخت ترین دشمن ہیں۔ ہم اس امر سے بھی تجاہل برت رہے ہیں کہ اسپین کا موجودہ ہیجان بالشویکوں کی سازش کا نتیجہ ہے۔ ہم یہ سمجھ کر اپنے دل کو تسلی دے دیتے ہیں کہ فرانس کے کاشتکار طبعاً قدامت پسند ہیں۔ اس لیے فرانس میں کمیونزم کی اشاعت اور پھیلاؤ کا کوئی خطرہ نہیں حالانکہ فرانسیسی پارلیمنٹ میں کمیونسٹوں کے نمائندوں کی تعداد بڑھ گئی ہے جیسا کہ دو برس ہوئے ہٹلر نے مجھ سے پیشین گوئی کرتے ہوئے کہا تھا بلجیم میں بھی کمیونزم کے بڑھنے کے آثار موجود ہیں۔ خود جرمن محسوس کرتے ہیں کہ ان کا ملک کمیونسٹوں کی زد میں ہے۔ ہم ان تمام باتوں کو خاموشی سے دیکھتے جا رہے ہیں اور سپین میں

عدم مداخلت کے اصول پر عمل کر کے بالواسطہ کمیونسٹوں کو امداد بھی پہنچا رہے ہیں اور جب اس صورت حال کے باعث اطالیہ اور جرمنی ہمارے خلاف اظہار ناراضگی کرتے ہیں تو ہم ان کی روش کو حیرت واستعجاب کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ہم کمیونزم کے خلاف جرمنی کے ساتھ مل کر ایک مشترکہ محاذ کیوں نہیں قائم کرتے ایسا مخالف کمیونسٹ محاذ اب بھی ہمارے لیے نہایت گراں قدر ثابت ہو سکتا ہے۔

اجتماعی عدم تحفظ

۱۹۳۰ء کے بعد ایک صاف سیدھی روش اختیار کرنے کے بجائے برطانوی حکومت نے بین الاقوامی معاملات میں نہایت غیر ایماندارانہ اور غیر شریفانہ حکمت عملی اختیار کی جس کا پہلا مظاہرہ اس وقت ہوا جب کہ سر جان سائمن نے منچوریا پر جاپانی حملہ کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی بلکہ جاپان کو منچوریا ہڑپ کر جانے کا پورا پورا موقع دیا۔ اس کے بعد اسی پالیسی کے تحت چیمبرلین نے حبشہ، اسپین، آسٹریا اور چیکوسلواکیہ کو فاسسطی آمروں کی نذر گاہ پر قربان کر دیا۔ یہ ساری پالیسی برطانیہ کے رجعت پسند مال دار طبقہ کی ذہنی پیداوار تھی۔ مزدور جماعت کی دوسری کابینہ جس کی تشکیل ۱۹۲۹ء میں عمل میں آئی اور جس میں رمزے میکڈانلڈ وزیر اعظم کے عہدہ پر فائز تھا ۱۹۳۱ء کے اقتصادی ہیجان کی بدولت ٹوٹ گئی اس کی جگہ ایک قومی حکومت قائم ہوئی جس مین اکثریت قدامت پرستوں کی تھی لیکن اس کابینہ کا وزیر اعظم بھی رمزے میکڈانلڈ تھا جو مزدور پارٹی کی مخالفت کے باوجود اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ قدامت پرستوں سے اشتراک عمل کر رہا تھا۔ مزدور جماعت نے بالآخر رمزے میکڈانلڈ اور اس کے دوسرے ساتھیوں کو غدار قرار دے کر اپنی پارٹی سے نکال دیا۔ اس طرح قومی وزارت کے مزدور ارکان کو ملک کے کسی حصہ کی تائید حاصل نہ تھی۔ اکتوبر ۱۹۳۱ء کے انتخابات میں قومی حکومت کے حامیوں کو بڑی زبردست کامیابی ہوئی اور ایک بڑی مدت تک برطانیہ کی خارجی حکمت عملی اسی وزارت کے ہاتھ میں رہی۔ رمزے میکڈانلڈ نے ۷ جون ۱۹۳۵ء کو قومی حکومت کی وزارت سے استعفیٰ دے دیا اور اس کی جگہ بالڈون جو

قدامت پسندوں کا لیڈر تھا وزیر اعظم بن گیا۔ اس کی نئی کابینہ ظاہری شکل کے اعتبار سے ایک مشترکہ حکومت تھی لیکن عملاً اس کی باگ ڈور قدامت پسندوں کے ہاتھ میں تھی۔

فاسسطی آمروں کے مقابلہ میں صلح جوئی کی جو پالیسی اس حکومت نے اختیار کی اس کے وجوہ و اسباب پر روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ ابتدا میں برطانیہ کے عوام علانیہ طور پر اس پالیسی کے مخالف تھے لیکن آخر کار انھیں دھوکا، فریب اور کذب و دروغ نے اس کی تائید کرنے پر مجبور کر دیا۔ وہ بھی یہ سمجھ کر چار و ناچار اس پر رضامند ہو گئے کہ شاید اس پالیسی کی بدولت جنگ کا خطرہ ٹل جائے۔ ابتدا میں جس وقت کہ قدامت پسندوں کی یہ حکومت برسر اقتدار آئی اس وقت برطانوی رائے عامہ کا کیا رجحان تھا اس کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ ۳۴۔۳۵ء میں لارڈ رابرٹ سیسل کے تحت برطانیہ کی مجلس اقوام یونین نے قیام امن کے بارے میں عوام کے خیالات معلوم کرنے کے لیے ایک رائے شماری کی جس میں ایک کروڑ پندرہ لاکھ افراد نے رائے دی۔ اس رائے شماری میں ایک بہت بڑی اکثریت نے تخفیف اسلحہ اور مجلس اقوام کی پرزور امداد کی پالیسی اختیار کرنے کی حمایت کی۔ اسی طرح ایک بھاری اکثریت نے فاسسطی آمروں کے جارحانہ اقدامات کے خلاف معاشی اور فوجی تدارکات کے استعمال کی پالیسی کو پسند کیا۔ بالڈون نے اس نتیجہ رائے دہی کو عوام کے احساسات کا صحیح ترجمان قرار دے کر ایک تقریر میں کہا کہ ہم عوام کی اس تائید کی بڑی قدر کرتے ہیں جیسا کہ میں اپنی پارک شائر والی تقریر میں بتا چکا ہوں۔ ہماری خارجی حکمت عملی کی بنیاد اب بھی یہی ہے کہ مجلس اقوام کو قوی سے قوی تر بنایا جائے۔ نومبر ۱۹۳۵ء میں قومی حکومت کے انتخابی منشور میں بتایا گیا تھا کہ مجلس اقوام اب بھی برطانوی حکمت عملی کا سنگ بنیاد رہے گی۔ مجلس کے دستور اور اس کے میثاق کی ہم پوری پوری حمایت کریں گے۔ اس میں کسی قسم کا تزلزل یا پس و پیش نہیں ہوگا۔ قدامت پرست پارٹی کے ایک انتخابی پوسٹر میں بالڈون کی تصویر بنائی گئی تھی اور اس میں یہ منظر پیش کیا گیا تھا کہ بالڈون میثاق مجلس اقوام پر انگلی رکھے ہوئے یہ کہہ رہا ہے کہ ہمارے الفاظ باقاعدہ معاہدوں سے زیادہ قابل وثوق ہیں۔ نومبر ۱۹۳۵ء کے انتخابات میں قومی

حکومت نے ایوان عام کی ۶۱۵ نشستوں میں سے ۴۳۱ نشستیں جیت لیں۔ یہ انتخابی کامیابی درحقیقت عوام کی اس توقع کا نتیجہ تھی کہ قومی حکومت برسر اقتدار آنے کے بعد مجلس اقوام کی پوری پوری حمایت کرے گی اور جارحانہ اقدام پسندوں کی سرکوبی کے لیے وہ مجلس اقوام کے زیر سیادت معاشی اور فوجی تدارکات کی مشینری کو استعمال میں لائے گی۔ قومی حکومت کے طرف داروں نے ان سے وعدہ بھی یہی کیا تھا لیکن رائے دہندوں کو یہ نہیں معلوم تھا کہ سر سموئیل ہور اور لاوال کے درمیان ستمبر میں بمقام جنیوا ایک خفیہ معاہدہ ہو چکا ہے کہ یہ دونوں حبشہ اور مجلس اقوام کے ساتھ غداری کریں گے اور یہ کہ انتخاب کے تین ہی ہفتہ بعد ایک اس سے بھی زیادہ شرمناک سودے کا راز افشا ہوگا۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آئندہ چار سال تک برطانوی لیڈروں کی اس ٹولی نے جس کو عوام نے اس شرط پر اقتدار عطا کیا تھا کہ وہ جارحانہ اقدام کرنے والی حکومتوں کو منہ توڑ جواب دیں گے اور عالمی امن وامان کو برقرار رکھنے کی پوری پوری جدوجہد کریں گے۔ حملہ آوروں اور دشمنان امن کی جارحانہ کارروائیوں سے دیدہ دانستہ چشم پوشی کی پالیسی اختیار کی گئی جس سے ساری دنیا میں ایک انتشار پیدا ہونا یقینی تھا۔ ان لیڈروں نے امن وامان کے نام پر مخالف امن طاقتوں کو امداد و تقویت پہنچائی۔

منچوریا کے معاملہ میں جاپان کے ساتھ جو مداہنت برتی گئی اس کو ایک نظیر قرار دے کر ان برطانوی لیڈروں نے اطالیہ کے ساتھ حبشہ کے معاملہ میں، جرمنی، کے ساتھ رہائن لینڈ کے معاملہ میں اور محوری طاقتوں کے ساتھ اسپین کے معاملہ میں نرمی اور دلجوئی کا سلوک کیا۔ ہر مرتبہ رائے عامہ کے کسی نہ کسی نمائندہ نے اس پالیسی کے خلاف پر زور احتجاج کیا اور ہر مرتبہ ایسے احتجاجات کو نظر انداز کر دیا گیا۔ دشمن امن طاقتوں کے ساتھ مداہنت کرنے والے لیڈروں نے ہر بار پارلیمنٹ اور پبلک کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ ان کے فیصلوں سے قیام امن اور زیادہ یقینی ہو جائے گا۔ قدامت پسندوں کے لیڈروں نے اپنی پالیسی کے جواز میں کہنا شروع کیا کہ مجلس اقوام بہت کمزور ادارہ ہے۔ اس لیے اس پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا، پھر انھوں نے کہنا شروع کیا کہ مجلس اقوام کی تائید کرنے کا تصور بھی دل میں نہ لانا

چاہیے کیوں کہ اس سے جنگ یقینی طور پر چھڑ جائے گی۔ مسولینی سلطنت برطانیہ فرانس یوگوسلاویہ یونان یا ترکی پر حملہ کر دے گا۔

چیمبرلین نے ۱۰ جون ۱۹۳۰ء کو ایک تقریر کے دوران میں کہا کیا یہ ظاہر نہیں ہے کہ تدارکات کے استعمال سے جنگ کا خطرہ قریب تر آ جائے گا۔ حقائق سے آنکھیں بند کر لینے سے کیا فائدہ۔ ۱۸ جون کو ایڈن نے اعلان کیا کہ تدارکات کے استعمال کو ترک کر دینے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے۔ اس نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ میرے خیال میں مجلس اقوام کا ایک رکن بھی ایسا نہیں جو فوجی طاقت کے استعمال پر راضی ہو۔ مجھے یہ گوارا نہیں کہ حبشہ کی آزادی کے تحفظ کی خاطر ہمارا ایک جہاز بھی جنگ میں ضائع ہو۔ حکومت کے ارکان نے حزب مخالف سے پارلیمنٹ میں چلا کر پوچھا کہ تم محوری طاقتوں سے لڑائی مول لینے پر تیار ہو۔ لارڈ سیسل نے لندن ٹائمس میں لکھتے ہوئے کہا ہم لڑائی سے اس طرح نہیں بچ سکتے کہ ہر مرتبہ جنگ کے خطرہ سے خوف زدہ ہو کر دشمن کے سامنے جھک جائیں یا اس کے شرائط مان لیں۔ اگر آج ہم چوروں سے ڈر کر دوسروں کا مال ان کے حوالہ کر دیں گے تو کل کے دن وہ ہمارے مال واسباب پر دست درازی کریں گے اور ہم خاموشی کے ساتھ اسے برداشت کر لیں گے۔ چرچل کی آواز کی طرح سیسل کی آواز بھی صدا بصحرا ثابت ہوئی۔

۱۹۳۸ء تک حالت یہ ہوگئی کہ محوری طاقتوں کے ہر اقدام پر برطانوی حکومت عاجزانہ سر نیاز خم کرنے لگی۔ ایڈن نے تنگ آ کر برطانوی کابینہ سے استعفا دے دیا۔ آسٹریا پر جرمنی کے کامیاب اقدام کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ برطانوی حکومت اس کمزور ملک کی مدد کرنے پر تیار نہ تھی۔ جب ہٹلر نے آسٹریا پر آناً فاناً قبضہ کر لیا تو لارڈ ہیلی فیکس دم بخود ہو کر کہنے لگا۔ یہ کیسی خوف ناک حرکت ہے۔ ہم نے یہ کبھی نہیں سمجھا تھا کہ یہ لوگ ایسا خوف ناک اقدام کریں گے لیکن جب ۱۷ مارچ کو روسی وزیر خارجہ لیٹوونوف نے برطانیہ کو خبردار کیا کہ اب چیکوسلاویکیہ کی باری ہے تو برطانوی حکومت نے اس کی یہ تجویز ٹھکرا دی کہ مجلس اقوام کی رکن حکومتوں اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی ایک مشترکہ کانفرنس کا انعقاد عمل میں

لایا جائے۔ جو اس بات پر غور کرے کہ آئندہ کے لیے جارحانہ اقدامات اور امن شکن کارروائیوں کا سدباب کیوں کر کیا جائے جس سے جنگ کا خطرہ رفع ہو جائے۔

اس کے بعد میونخ کا قضیہ پیش آیا۔ برطانوی حکومت نے چیکوسلاویکیہ کو دھمکیاں دے کر اسے ہٹلر کے آگے جھک جانے پر مجبور کر دیا۔ چیمبرلین میونخ سے واپس آیا تو اس کا بڑا شاندار خیر مقدم ہوا اور ساری قوم نے اسے ایک نجات دہندہ سمجھ کر خوش آمدید کہا۔ کابینہ کا صرف ایک رکن مسٹر ڈف کوپر اس ذلت کو نہ برداشت کر سکا اور وزارت سے مستعفی ہو گیا۔ ایوان عام میں بیان دیتے ہوئے اس نے کہا ہم ۱۹۱۴ء میں بلجیم یا سربیا کے لیے نہیں لڑے تھے بلکہ ہم اس وقت اس غرض سے لڑ رہے تھے کہ کسی ایک بڑی طاقت کو سارے یورپ پر اتنا اقتدار جمانے کا موقع نہ حاصل ہونے پائے اور کسی حکومت کو یہ جرات نہ ہو کہ وہ بین الاقوامی معاہدات کی خلاف ورزی کرے اور محض اپنی فوجی طاقت کے بل پر من مانی کارروائیاں کرنے لگے۔ اسی بات کے لیے ہمیں ایک ہفتہ پیشتر جرمنی سے لڑنا چاہیے تھا۔ میں نے میونخ کی تلخ شرائط کو نگلنے کی کوشش کی لیکن وہ میرے حلق سے نیچے نہ اتر سکے۔ چرچل نے تقریر کرتے ہوئے کہا ہمیں ایک بڑی زبردست اور کامل شکست ہوئی ہے۔ اس وقت انگلستان اور فرانس ایک بڑی مصیبت سے دوچار ہیں۔ ہمیں حقائق سے آنکھیں بند نہیں کرنی چاہییں۔ ان آوازوں کا برطانوی حکومت پر کوئی اثر نہ ہوا۔ ایوان نے ۱۴۴ آرا کے مقابلہ میں ۳۶۶ آرا سے چیمبرلین کی تائید کی۔ وزیراعظم اطمینان کے ساتھ مچھلیوں کا شکار کھیلنے اسکاٹ لینڈ چلا گیا۔

بالآخر جب یہ ظاہر ہو گیا کہ ہٹلر اور مسولینی کی خدمت میں انگلستان اور فرانس نے جو نذرانے پیش کیے تھے ان سے ان دونوں کے توسیعی اقدامات اور جنگی منصوبوں میں کوئی فرق نہ آئے گا تو اب آخری لمحہ میں جرمنی اور اطالیہ کے خلاف ایک متحدہ فوجی محاذ ہٹانے کی کوشش شروع کی گئی۔ ۳۱ مارچ ۱۹۳۹ء کو چیمبرلین نے ایوان عام میں اعلان کیا کہ پولینڈ کی خودمختاری کو خطرہ میں ڈالنے والی کوئی کارروائی عمل میں آئی تو برطانوی حکومت پولینڈ کو

پوری پوری مدد دے گی۔ بیس سال میں پہلی مرتبہ برطانیہ نے مشرقی یورپ کی ایک حکومت سے دفاعی معاہدہ کیا جب کہ صورت حال اتنی نازک ہوگئی تھی۔ ۲ اپریل ۱۹۳۹ء کو اطالیہ نے البانیہ کو اپنی سلطنت میں شامل کر لینے کا اعلان کیا۔ اس کے بعد فوراً ہی چیمبرلین نے رومانیہ یونان اور ترکی سے وعدہ کیا کہ اگر ان پر کوئی طاقت حملہ آور ہوگی تو برطانیہ ان کی پوری پوری مدد کرے گا۔

ان فوجی معاہدات میں بنیادی خرابی یہ تھی کہ ان میں جغرافیائی اور ریاضیاتی حقائق کو پیش نظر نہیں رکھا گیا۔ پولینڈ، رومانیہ اور ترکی کو اگر کوئی طاقت ہٹلر اور مسولینی سے بچا سکتی تھی تو وہ انگلستان اور فرانس نہیں بلکہ روس تھی۔ لیکن چیمبرلین نے روس سے گفت وشنید کے بغیر ان ملکوں سے معاہدے کر لیے اور جب اسٹالن نے روسی امداد کی پیش کش کی تو اس نے اس پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ پھر جب یہ پالیسی بھی ناکام ہوتی نظر آئی تو ۱۹۳۹ء کے موسم گرما میں قدامت پرستوں کے لیڈروں نے روس سے سمجھوتہ کرنے کے بجائے اسی قدیم صلح جوئی کی پالیسی پر کاربند ہونے کی کوشش کی اور برطانوی حکومت کے ترجمان نے پھر ایک مرتبہ اعلان کیا کہ وہ ہٹلر اور مسولینی سے تمام متنازعہ مسائل کو گفت وشنید اور امن پسندانہ مصالحت کے ذریعے طے کرنے پر تیار ہیں۔ مئی میں چیمبرلین اور سر جان سائمن نے ہٹلر کو دس لاکھ پونڈ کا وہ سونا حوالے کر دینے کی اجازت دے دی جو چیکوسلاوکیہ نے لندن میں جمع کر رکھا تھا۔ جولائی میں سر ہاریس ولیم اور رابرٹ ایس ہڈسن نے ہٹلر کے اقتصادی مشیر کے ساتھ جرمنی کو ایک ارب پاؤنڈ کا برطانوی قرضہ دینے کے مسئلہ پر گفت وشنید کی۔ اگرچہ ساتھ ہی چیمبرلین نے یہ اعلان بھی کیا کہ ان مباحث کی نوعیت غیر سرکاری ہے۔ جرمنی کے ساتھ ان دوستانہ مراسم نے ان لوگوں کی بے اطمینانی میں اور اضافہ کر دیا جو ہٹلر اور مسولینی کے خلاف ایک طاقت ور سیاسی اور عسکری محاذ قائم کرنا چاہتے تھے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ برطانوی حکومت نے اپنے حلیف پولینڈ کو جسے اس نے جرمن کے حملہ کی صورت میں فوجی امداد دینے کا وعدہ کیا تھا، ایک مطلوبہ قرضہ دینے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ جب تک پولینڈ کی

حکومت اس رقم کو انگلستان کے اندر ہی خرچ کرنے پر راضی نہ ہوگی، اس وقت تک ہم اسے قرضہ نہیں دے سکتے۔

محوری طاقتوں کو روکنے میں صرف ایک حکومت یعنی روس کی امداد مفید طلب ہو سکتی تھی۔ لیکن روس کے ساتھ برطانوی حکومت کی گفت و شنید کی ناکامی غیر متوقع نہ تھی کیوں کہ برطانیہ کی قیادت پر جو لوگ فائز تھے وہ روس سے دوستی نہیں چاہتے تھے۔ لائیڈ جارج چرچل اور دوسرے حقیقت پسند رہنماؤں نے بار بار برطانوی حکومت کو متنبہ کیا کہ قیام امن کی تمام کوششیں بالکل رائیگاں جائیں گی اگر محوری طاقتوں کے خلاف روس کی امداد نہ حاصل کی گئی۔ لیکن چیمبرلین اور لارڈ ہیلی فیکس روس کی امداد سے بدستور خائف رہے۔ روس کے خلاف جو تعصبات ان کے دلوں میں جم گئے تھے ان سے خلاصی پانا ایک امر دشوار تھا۔ مارچ میں لٹیوناف روسی وزیر خارجہ نے محوری طاقتوں کے خلاف ایک مشترکہ کانفرنس منعقد کرنے کی تجویز کی تھی لیکن برطانوی حکومت نے اس تجویز کو بھی ٹھکرا دیا تھا۔ اپریل کے وسط تک روس کے ساتھ کوئی گفتگو عمل میں نہیں آئی کیوں کہ برطانوی حکومت فاسسطی آمروں کو ناراض کرنا نہیں چاہتی تھی۔ ۷ مئی کو لٹیوناف جو کہ برطانیہ اور فرانس سے روس کی دوستی کا حامی تھا۔ وزارت خارجہ کے عہدہ سے مستعفی ہو گیا لیکن برطانیہ کے حکمرانوں پر اس واقعہ کا بھی کوئی اثر نہ ہوا۔

اس کے بعد روس کے ساتھ ایک طول طویل گفتگو شروع ہوئی جو پانچ ماہ تک جاری رہی۔ روس چاہتا تھا کہ برطانیہ اس سے ایک مستقل دفاعی معاہدہ کرے اور اس معاہدہ کے ارکان بالٹک کی ریاستوں پر کوئی جارحانہ حملہ ہو تو سب کے سب مل کر اس حملہ آور کا مقابلہ کریں۔ روس نے یہ بھی کہا کہ فوجی نقطہ نظر سے پولینڈ کو امداد پہنچانا اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ روسی فوجوں کو لڑائی کی حالت میں پولینڈ کے علاقہ میں داخلہ کی اجازت ہو لیکن چیمبرلین اور لارڈ ہیلی فیکس جنھوں نے چین، حبشہ، آسٹریا، چیکوسلاویکیہ اور البانیہ کو فاسسطی آمروں کی نذر گاہ پر قربان کر دیا تھا، اب یکا یک چھوٹی قوموں کی آزادی کے تحفظ کا

دم بھرنے لگے۔ برطانیہ کا عذر یہ تھا کہ بالٹک کی ریاستیں بڑی طاقتوں سے کسی قسم کی فوجی ضمانت نہیں چاہتی ہیں۔ اس لیے ایسی فوجی ضمانت دینا اس کے لیے مناسب ہوگا۔ اسی طرح چونکہ پولینڈ کے حکمران روس کی امداد طلب کرنے سے بہتر یہ سمجھتے تھے کہ اپنے ملک کو ہٹلر کے حوالہ کردیں، اس لیے برطانوی حکومت اس پر بھی راضی نہ ہوئی کہ روس پولینڈ کی فوجی امداد کرے۔ بالآخر پانچ ماہ کی لایعنی گفتگو کے بعد روسی برطانوی تحالف کی تجویز ناکام رہی لیکن ایسے حلیفانہ معاہدہ کی ضرورت برطانیہ کو تھی نہ کہ روس کو۔ اسٹالن کو کیا پڑی تھی کہ وہ ایسے شرائط پر برطانیہ یا فرانس سے معاہدہ کرتا جنھیں وہ ناقابل عمل خیال کرتا تھا۔ روس کے غیر جانبدار رہنے کی صورت میں ہٹلر اسے وہ سب کچھ دے دینے پر تیار تھا جو برطانیہ روس کے ساتھ فوجی معاہدہ کرنے کے بعد بھی اسے دینا نہیں چاہتا تھا۔ باوجودیکہ چیمبرلین اور دلادیر نے علانیہ کہا کہ انھیں روسی جرمن گفت وشنید کا کوئی علم نہیں ہے۔ مئی اور جون ہی میں ان دونوں کو معلوم ہو چکا تھا کہ روس اور جرمنی سے ایک معاہدہ کی بابت خفیہ بات چیت ہو رہی ہے لیکن اس عظیم ترین خطرہ کے وقت بھی یہ دونوں روس کے شرائط معاہدہ ماننے یا اس کے ساتھ فوجی تحالف کرنے پر تیار نہیں ہوئے۔ اس لیے اسٹالن نے آسان تر راہ اختیار کی اور ۲۳ اگست کو جرمنی اور روس کے درمیان ایک معاہدہ اقدام عمل میں آ گیا جس کی وجہ سے ہٹلر کی عظیم الشان فوجی طاقت کے مقابلہ میں برطانیہ اور فرانس میدان میں بالکل تنہا رہ گئے۔

برطانیہ نے جن حالات میں جرمنی کے خلاف جنگ کا آغاز کیا اس سے زیادہ اندیشہ ناک حالات میں اسے کبھی جنگ کرنی نہیں پڑی تھی۔ درحقیقت اسپین، میونخ اور ماسکو کے واقعات کے بعد وہ عملاً جنگ ہار چکا تھا۔ فرانس جیسے شکست خوردہ ملک اور پولینڈ جیسی کمزور طاقت کو ساتھ لے کر تن تنہا ہٹلر کے مقابلہ پر آ جانے کے معنی یہ تھے کہ برطانیہ اپنے آپ کو دیدہ دانستہ تباہی کی طرف لے جا رہا تھا لیکن جنگ نہ کرنے کی صورت میں بھی اس تباہی سے بچاؤ کا کوئی امکان نہ تھا۔ کیوں کہ اب چیمبرلین کو بھی معلوم ہوگیا تھا کہ ہٹلر کے حقیقی ارادے کیا ہیں۔ دوروز کی ٹال مٹول کے بعد جس میں فرانسیسی وزیراعظم بانٹ نے پولینڈ

سے غداری کرنے کی پوری پوری کوشش کی، لارڈ ہیلی فیکس نے جرمن سفیر کو ایک نوٹ حوالہ کیا جس میں بتایا گیا تھا کہ چوں کہ برطانوی الٹی میٹم کا جرمنی نے کوئی جواب نہیں دیا تھا، اس لیے گیارہ بجے دن سے برطانیہ اور جرمنی کے مابین حالت جنگ قائم ہو چکی ہے۔

(ج) امریکہ

امریکہ کے متعلق فریڈرک شومین لکھتا ہے:

امریکہ کو یورپین اقوام نے آباد کیا تھا اور یہ ملک کولمبس کے زمانہ سے یورپ کے سیاسی نظام کا ایک جزو تھا۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کو انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے میں صرف اس وجہ سے کامیابی ہوئی کہ ۱۷۷۶ء میں امریکن باغیوں کو فرانس نے پوری مستعدی اور قوت سے انگریزوں کے خلاف مدد بہم پہنچائی۔ امریکہ کی لاطینی ریاستوں کو بھی ایک یورپین جنگ کے نتیجہ میں آزادی ملی۔ ان جنوبی امریکی ریاستوں کی بقا و تحفظ میں محض ۱۸۲۳ء کے اصول مانرو کا دخل نہیں تھا جس کی رو سے امریکی معاملات میں یورپین اقوام کی مداخلت کو ممنوع قرار دیا گیا تھا بلکہ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ برطانیہ اپنی تجارتی اغراض کے لیے ان کی خود مختاری کی حفاظت کرنا اور براعظم یورپ کی طاقتوں کو ان پر دوبارہ قبضہ جمانے سے روکنا چاہتا تھا۔

پہلی جنگ عظیم کی ابتدا میں امریکہ کی رائے عامہ یورپین اقوام کی باہمی جنگ و جدال سے بالکل الگ رہنے کے موافق تھی لیکن ۱۹۱۷ء تک امریکی حکومت کی روش میں بڑی تبدیلی واقع ہوئی اور وہ روز بروز اتحادیوں کی طرف مائل ہوتی گئی جبکہ اس تبدیلی کے تحت میں انسانیت دوستی کا کوئی جذبہ نہیں تھا۔ جیسا کہ امریکی لیڈر اپنی تقریروں میں ظاہر کرنا چاہتے تھے بلکہ تجارتی اور سیاسی اغراض امریکہ کو اس طرف لے جا رہے تھے۔ امریکی سرمایہ داروں نے متحدین کو بڑی بڑی رقمیں قرض دی تھیں اور امریکی سوداگروں نے جن کے ہاتھ میں ملک کی بیرونی تجارت تھی متحدین کے ممالک کو بڑے بڑے منافع پر کثیر مقدار میں سامان تجارت فروخت کیا تھا جس کی قیمت ان سے وصول طلب تھی۔ ان حالات میں

متحدین کے شکست کھا جانے کے معنی یہ ہوتے کہ دیوالیہ ہو جانے کے باعث انھیں مجبوراً امریکی سرمایہ اور قرضہ کی ادائیگی سے دستکش ہو جانا پڑتا اور اس طرح امریکی سرمایہ داروں اور تاجروں کی وصول طلب رقوم بالکل ضائع ہو جاتیں۔ جرمنی اور اس کے حلیفوں کی فتح سے نہ صرف امریکہ کے معاشی مفاد کو سخت دھکا پہنچتا بلکہ یورپ کا توازن قوت درہم برہم ہو جاتا اور جرمنی کی غیر معمولی طاقت سے بالآخر خود امریکہ کے تحفظ کو خطرہ پیدا ہو جاتا۔

جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد امریکہ نے پھر ایک مرتبہ یورپی معاملات سے علیحدگی کی روش اختیار کی۔ چند سمجھ دار لوگوں کے سوا جو یہ چاہتے تھے کہ امریکہ ایسے طرز کی غیر جانب داری نہ اختیار کرے جو جارحانہ اقدام کرنے والی جنگ پسند سلطنتوں اور امن پسند ممالک دونوں کے ساتھ یکساں سلوک پر مبنی ہونے کی وجہ سے بالواسطہ جنگ پسندوں کی امداد کا موجب ہو۔ امریکی عوام اور لیڈروں کی عظیم اکثریت یورپ کے جھگڑوں سے علیحدہ رہنا ہی پسند کرتی تھی اور اس مقصد کے پیش نظر ظالم ومظلوم، طاقتور اور کمزور، جنگ پسندوں اور امن پسندوں کے مابین کوئی امتیاز قائم کرنے پر تیار نہ تھی۔ چنانچہ ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۶ء میں امریکن غیر جانب داری کو موثر بنانے کے لیے کئی قوانین نافذ کیے گئے لیکن ان قوانین کے نفاذ سے پہلے امریکی سنات کی ایک قرارداد کے بموجب سات ارکان سنات کی ایک کمیٹی نے جس کا صدر جیرالڈ پی۔ نائی تھا، اسلحہ سازی کے کاروبار کی تحقیقات شروع کی۔ ان تحقیقات کنندوں نے بر بنائے واقعات وشواہد ثابت کیا کہ اسلحہ بنانے والی خانگی کمپنیوں نے متعدد بار حکومت کے ایسے تمام قوانین کی یا تو خلاف ورزی کی تھی یا ان سے گریز کی راہیں تلاش کر لی تھیں جو اسلحہ سازی پر قابو حاصل کرنے یا نگرانی قائم رکھنے کی غرض سے نافذ کیے گئے تھے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کاروبار سے فائدہ اٹھانے والے اشخاص کو سرکاری عہدہ داروں کو رشوت دے کر بیرونی ممالک سے اسلحہ سازی کے ٹھیکے حاصل کرنے میں بھی سرکاری عہدہ داروں سے ان کو بڑی مدد ملی۔ اس امر کی بھی شہادت دستیاب ہوئی کہ اسلحہ سازی کے کارخانہ داروں نے ہتھیاروں کی برآمد اور فروخت کی ممانعت کے قوانین کی

مخالفت کرنے کے لیے اخباروں کے ذریعے منظم پروپاگنڈے کا بازار گرم کر رکھا تھا اور امریکہ کے فوجی مصارف میں اضافہ کی تجاویز کو کامیاب اور وسیع کرنے کے لیے متعلقہ اشخاص کو بے حد و بے حساب روپیہ کھلایا تھا۔ مزید برآں امریکی اسلحہ سازوں نے بیرونی ممالک کے ہم پیشہ افراد سے کئی راضی نامے کر رکھے تھے جن کا مقصد یہ تھا کہ اسلحہ کی فراہمی اور بہم رسانی کے لیے دنیا کے مختلف علاقوں کو آپس میں تقسیم کر لیا جائے۔ اس طرح امریکی تحقیقاتی کمیٹی نے بربنائے واقعات وشواہد ثابت کر دیا کہ موت کے ان سوداگروں نے سارے عالم میں اپنی خفیہ کارروائیوں کا جال پھیلا رکھا ہے۔

آگے چل کر شومین لکھتا ہے:

''امریکہ اس ذہنی اور روحانی خانہ جنگی سے محفوظ نہ تھا جس سے مغربی ممالک کی روح زخمی ہو چکی تھی اور جس کے نتیجہ میں فرانس اور برطانیہ پر زمانہ کساد بازاری میں انتشار و زوال کے آثار پورے طور پر طاری ہو چکے تھے۔ بڑی بڑی جائیدادیں اور سرمایہ رکھنے والوں کے دل میں کمیونزم کا اتنا ہی خوف تھا جتنا یورپ میں لیکن امریکی مداخلت پسندوں اور علیحدگی پسندوں کے درمیان اختلافات زیادہ شدید تھے۔ انگریز اور فرانسیسی علیحدگی پسند جو بین الاقوامی جھگڑوں سے علیحدہ رہنے کو ترجیح دیتے تھے، رجعت پسند عناصر پر مشتمل تھے جن کا بے اندازہ سرمایہ ان کے قومی بینکوں میں جمع تھا۔ اس کے برخلاف انگریزوں اور فرانسیسیوں کی مداخلت پسند پارٹیاں جو دنیا کو اجتماعی تحفظ اور امن و انصاف کے اصولوں پر چلانا چاہتی تھیں جمہوریت پسند عناصر پر مشتمل اور مزدوروں و کسانوں وغیرہ کے احساسات کی ترجمان تھیں۔ امریکہ میں صورت حال اس کے برعکس تھی۔ یہاں بڑے بڑے سرمایہ دار مداخلت پسند تھے اور متوسط طبقات، مزدوروں اور کسانوں کے ترجمان بین الاقوامی جھگڑوں سے علیحدہ رہنا چاہتے تھے۔ کانگرس، امریکی صحافت اور امریکی عوام کا ایک مفروضہ یہ تھا کہ امریکہ کو سابقہ جنگوں میں گھسیٹنے کی ذمہ داری اسلحہ سازی کے تاجروں اور صنعت کاروں، مالکان بینک اور تاجران برآمد پر تھی جنھوں نے انسانی قتل وخون ریزی کو اپنے ذاتی منافع کا وسیلہ بنا لیا تھا۔ یہ مفروضہ بڑی حد تک

صحیح تھا لیکن پورے طور پر نہیں۔ بہر حال اسی مفروضہ کی بنا پر ۱۳ اگست ۱۹۲۵ء کو جب اطالیہ اور جبشہ کے تعلقات کی خرابی کے باعث یورپین جنگ کا خطرہ سر پر آ گیا، امریکی کانگرس نے ایک قانون غیر جانب داری منظور کیا جس میں بتایا گیا تھا کہ اگر کوئی دو ممالک آپس میں برسر جنگ ہو جائیں تو صدر امریکہ اس امر کا اعلان کرے گا اور ایسے اعلان کے بعد سے ان دونوں ممالک کو اسلحہ اور آلات جنگ یا جنگی مشینوں کے پرزوں کی فراہمی اور برآمد ممنوع قرار پائے گی۔

اس قانون کے نفاذ کے بعد محارب ملکوں سے صرف اسلحہ کی تجارت موقوف ہوگئی لیکن دوسری اشیائے تجارت کی برآمد کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ اس کے علاوہ اسلحہ کی برآمد کے بارے میں جو ممانعت کی گئی اس میں اس امر کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا کہ محارب ملک حملہ آور ہے یا جائز طور سے اپنے ملک کی مدافعت کر رہا ہے۔ یعنی ظالم و مظلوم حملہ آور اور مدافع کو ایک ہی صف ہی رکھا گیا تھا۔ جس کے معنی یہ تھے کہ اگر کوئی حکومت ظالمانہ طور پر کسی دوسری کمزور قوم پر حملہ کرے تو غیر جانب داری کے قانون کی رو سے صرف حملہ آور ہی کو ہتھیاروں کی فراہمی سے نہیں روکا جائے گا بلکہ وہ کمزور قوم بھی جس کو اپنے ملک کی مدافعت کے لیے اسلحہ درکار ہو۔ امریکی اسلحہ خریدنے کی حق دار نہ ہوگی۔

جبشہ پر اطالیہ کے حملہ کے دو روز بعد ۵ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو صدر روز ویلٹ نے اعلان کیا کہ جبشہ اور اطالیہ دونوں محاربین کو ہتھیار، آلات حرب اور سامان جنگ کی برآمد ناجائز اور خلاف قانون قرار دے دی گئی ہے۔ اعلان میں اس واقعہ کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا تھا کہ اطالیہ نے مجلس اقوام کے تصفیہ کے بالکل برخلاف اور اس کی رضامندی حاصل کیے بغیر ایک بے گناہ قوم پر حملہ کر کے جارحانہ جنگ کا آغاز کیا ہے۔ اس طرح اسلحہ اور آلات حرب کی برآمد کو ممنوع قرار دینے سے اطالیہ کو حملہ آور ہونے کے باوجود بمقابلہ جبشہ زیادہ فائدہ پہنچا جبکہ جبشہ کو خواہ مخواہ اپنی بے گناہی کی سزا بھگتنی پڑی۔ کیوں کہ جبشہ کے لیے اب اس کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں تھی کہ وہ امریکہ سے اسلحہ خرید کر اپنے ملک کی مدافعت کر سکے۔ اس کے برعکس اطالیہ ہتھیار اور سامان جنگ کے ماسوا دوسری تمام اشیا امریکہ سے حاصل کر سکتا

تھا۔ چنانچہ صدر روز ویلٹ کے اعلان کے بعد ہی اطالیہ اور امریکہ کے تجارتی لین دین کی رفتار میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ اطالوی افریقہ کو سامان تجارت کی جو مقدار امریکہ برآمد کرتا تھا، اس کی قیمت ۱۹۳۴ء میں اوسطاً ۲۵۴۰۳ ڈالر ماہانہ تھی لیکن اسی سامان کی قیمت اکتوبر ۱۹۳۵ء میں ۳۶۷۷۸۹ ڈالر اور نومبر ۳۵ میں ۵۸۳۷۳۵ ڈالر ہو گئی۔ اطالیہ کو خام تیل جس مقدار میں برآمد ہوتا تھا اس میں ۶۰۰ فی صد کا اضافہ ہو گیا۔ اطالوی افریقہ کو اس زمانہ میں جو خام تیل برآمد کیا گیا وہ گزشتہ سالوں کی برآمدات کے مقابلہ میں دس لاکھ فی صد زیادہ تھا۔ حبشہ کی امریکی برآمدت میں بڑی بھاری تخفیف ہو گئی۔ امریکی قوم کے اخلاقی مواعظ و نصائح کا اطالیہ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ تیل کی وافر مقدار پہنچ جانے سے مسولینی کو بالآخر حبشہ پر مکمل فتح نصیب ہوئی اور اس تیل کا زیادہ حصہ امریکہ سے ہی برآمد کیا گیا تھا۔ امریکہ کے کاروباری حلقوں نے حسب معمول اس جنگ سے خوب روپیہ کمایا اور ان کی تمام کارروائیوں اور سرگرمیوں سے حملہ آور اطالیہ کو مدد اور تقویت پہنچی۔

مشرق بعید میں بھی امریکی قانون غیر جانب داری کا فائدہ جاپان کو حاصل ہوا جس نے چین پر حملہ کر کے اس کے وسیع اور زرخیز علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ ۲۶ جولائی کو امریکہ نے جاپانی حکومت کو اطلاع دی کہ ۱۹۱۱ء کا معاہدہ کالعدم ہو چکا ہے۔ اس کے باوجود چین کے حملہ آوروں یعنی جاپان کو امریکہ سے بڑی بھاری مقدار میں سامان ملتا رہا۔ چنانچہ جاپان نے تیل کے ۶۵ فی صد ذخائر، ۶۵ فی صد موٹر کاریں، ۷۷ فی صد ہوائی جہاز اور ۹۰ فی صد لوہا اور تانبا امریکہ کی منڈیوں سے خریدا۔ اس عمل اور طریق کار سے حملہ آور طاقتوں اور جارحانہ حکومتوں نے بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا کہ جنگ جوئی اور بین الاقوامی لوٹ مار کی کارروائیوں میں امریکہ کوئی مداخلت نہیں کرے گا اور نہ کوئی ایسا قدم اٹھائے گا جس سے ان کی راہ میں کوئی رکاوٹ پیدا ہو۔

درحقیقت امریکی خارجی پالیسی کو دانش مندی اور وسیع النظری سے دور کا بھی علاقہ نہ تھا۔ اگر ۱۹۳۷ء میں امریکہ فاسسطی حکومتوں کے مقابلہ میں ان کمزور ممالک کی پوری

پوری مدد کرتا جن پر یکے بعد دیگرے یہ حکومتیں قابض ہوتی جارہی تھیں تو روم، برلن اور ٹوکیو کے جنگ آزما حکمرانوں کو دول عظمیٰ سے لڑائی مول لینے کی جرات نہ ہوتی۔ کیوں کہ ابھی تک فاسسطی حکومتوں کی طاقت اتنی زبردست نہیں ہوئی تھی۔ اس طرز عمل کا لازمی اثر اور نتیجہ یہ ہوتا کہ ہٹلر، مسولینی اور ٹوجو کے قدم رک جاتے اور ان کے جارحانہ منصوبوں کی ناکامی کے باعث عوام میں انھیں وہ مقبولیت کسی طرح نہ حاصل ہوسکتی جس کے بل پر انھوں نے اپنے عزائم کا نقشہ مرتب کیا تھا بلکہ ممکن تھا کہ داخلی اختلافات ان حکومتوں کو نیست ونابود کردیتے۔ کیوں کہ ان کے استحکام کا سارا دارومدار اس بات پر تھا کہ جو توقعات عوام نے اس سے وابستہ کی تھیں وہ پوری ہوسکیں گی یا نہیں۔ لیکن پہلے تو انگریزوں اور فرانسیسیوں کی غلط پالیسی نے ان کی کامیابیوں کی راہ کھول دی۔ دوم خود امریکہ کے لوگ اپنی حفاظت اسی میں خیال کرتے تھے کہ عالمی امن کے قیام کے لیے انھیں کوئی خطرہ نہ مول لینا پڑے۔ چنانچہ ایسے تمام عناصر پر جو فاسسطی حکومتوں کے مقابلہ میں جرات مندانہ اقدام کے حامی تھے، امریکہ میں کمیونسٹ ہونے کا شبہ کیا جاتا تھا۔ ۱۹۲۹ء تک امریکہ کا موقف اتنا مضبوط تھا کہ اگر وہ چاہتا تو یورپ میں لڑائی کو روک دیتا مثلاً اگر امریکی حکومت یہ اعلان کردیتی کہ جس ملک پر ہٹلر یا مسولینی حملہ آور ہوں گے امریکہ اس کی پوری پوری امداد کرے گا تو ان دونوں آمروں کو جنگ شروع کرنے کی جرات ہرگز نہ ہوتی اور اب تو لندن اور پیرس کی حکومتیں بھی اس قسم کے اقدام پر تیار تھیں لیکن کیمونزم کے مہمل خوف اور فاسسطیوں کے ساتھ خفیہ ہمدردی کے جذبہ نے امریکہ کو اس جرات مندانہ اقدام سے باز رکھا۔

بالآخر جب دوسری جنگ عظیم کا آغاز ہوگیا اور جاپانیوں کے مقابلہ پر امریکہ کو شریک جنگ ہونا پڑا تو اہل امریکہ کے لیے کہ اس جنگ کا تجربہ بہت زیادہ خوشگوار ثابت نہیں ہوا کیوں کہ ان کے دل شکوک وشبہات اور احساس گناہ سے لبریز تھے۔ اولاً فرانس، انگلستان اور دوسرے حلیفان جنگ کے برعکس امریکہ کی سرزمین پر نہ تو دشمن کا کوئی فوجی حملہ ہوا اور نہ فضائی بمباری سے اس کو کوئی نقصان پہنچا۔ جو امریکن سپاہی جنگ

میں ہلاک یا زخمی ہوئے ان کی تعداد یورپ اور ایشیا کے برسر جنگ ممالک کے مقتولین اور مجروحین کی تعداد کے مقابلہ میں صفر تھی۔ حالانکہ یہ سب لوگ ایک مشترکہ مقصد کے لیے لڑ رہے تھے، دوم اس جنگ کی بدولت امریکہ کو بے شمار معاشی فوائد حاصل ہوئے اور اس کی دولت وثروت میں بے اندازہ اضافہ ہو گیا۔ پٹہ اور قرضہ کی اسکیم کے تحت امریکی حکومت نے دوسرے ممالک کو جو لامحدود سرمایہ قرض دیا اور جنگی ضروریات پر اسے جو خطیر رقمیں صرف کرنی پڑیں وہ درحقیقت کاغذی قربانیاں تھیں۔ کیوں کہ محصولات میں اضافہ اور اشیائے خوردنی کی کمی کے باوجود ہر ڈالر جو امریکہ کو خرچ کرنا پڑا کسی نہ کسی شکل میں امریکی سپاہیوں، افسروں نظم ونسق کے عہدہ داروں، کارخانوں کے مالکوں، بینک کے ساہوکاروں، مزدوروں اور کسانوں کی جیبوں میں پھر واپس ہو جاتا تھا۔ امریکی تاجروں اور صنعت کاروں کے مصارف میں بے انتہا اضافہ عمل میں آیا۔ قومی آمدنی تقریباً دوگنا ہوگئی، بے کاری کا نام ونشان نہ رہا اور امریکی قوت پیداوار میں دن دونی اور رات چوگنی ترقی ہوئی۔ ان حالات میں اگر امریکہ کا اجتماعی ضمیر اس جنگ کے دوران میں غیر مطمئن رہا تو اس میں کوئی امر باعث تعجب نہ تھا۔

دوسری جنگ عظیم کے اختتام کے بعد اپریل ۱۹۴۵ء میں جب کہ ٹرومین کو امریکہ کی صدرات ملی اس وقت حکومت اور نظم ونسق کی داخلی ہیت کیا تھی، اس کا حال شومین نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''امریکی سلطنت کا موثر اقتدار بینک کے مالکوں اور فوجی افسروں کے ہاتھوں میں منتقل ہو گیا تھا۔ مثلاً محکمہ دفاع کا سیکرٹری جیمس فارسٹل ڈلن ریڈ اینڈ کمپنی کا سابقہ صدر تھا جس میں محکمہ فوج کا انڈر سیکرٹری نائب صدر تھا۔ محکمہ تجارت کا سیکرٹری مسٹر ایوہرل ہیریمین نہ صرف خاندانی کروڑ پتی تھا بلکہ براؤن بروس، ہیریمن اینڈ کمپنی کا بانی بھی تھا۔ اسی کمپنی کا ایک شریک رابرٹ لاوٹ تھا جو امریکہ کے انڈر سیکرٹری آف اسٹیٹ چارلس سالٹز مین نیویارک کے اسٹاک ایکسچینج کا نائب صدر تھا۔ امریکی محکمہ خزانہ کا سیکرٹری جان سنڈر

سینٹ لوئی کا ایک ساہوکار تھا۔ پوپ کے دربار میں امریکی صدر کا سفیر مائرن ٹیلر امریکہ کی صنعت فولاد کے بورڈ کا نائب تھا۔ ۱۹۴۰ء تک حسب ذیل عہدے جن پر عموماً سول سروس کے اشخاص مامور کیے جاتے تھے پیشہ ور فوجیوں کے ہاتھوں میں تھے۔

صدر امریکہ کا چیف آف دی اسٹاف	ولیم ڈی لیھی	William D Leahy
سیکرٹری آف اسٹیٹ جارج سی مارشل	جارج سی مارشل	George C Marshall
اسسٹنٹ سیکرٹری آف اسٹیٹ	چارلس رالٹز مین	Char les Saltz Man
سیکرٹری محکمہ فوج	کینتھ سی رائل	Kenneth C Royall
انڈر سیکرٹری محکمہ فوج	ولیم ایچ ڈریپر	William H Draper
جرمنی کا گورنر	کلے	Clay
جاپان کا گورنر	میک آرتھر	Mac Arthur
آسٹریا کا گورنر	جیوفری کیز	Geoffrey Keyes
امریکی سفیر خاص متعینہ چین	ویڈمیر	Wed Meyer
امریکی سفیر خاص روس	والٹر بیڈل اسمتھ	Walter Bedell Smith
امریکی سفیر خاص پانامہ	تھامس ہال کومب	Thomas Halcomb
امریکی سفیر خاص جنوبی افریقہ	فرینک ٹی ہائنس	Frank T Hins
امریکی سفیر خاص بلجیئم	الن جی کرک	Rllen G Kirk

ٹرومین کے دور حکومت میں اختتام جنگ کے دو سال کے اندر امریکہ دس ارب ڈالر سالانہ اسلحہ سازی پر صرف کر رہا تھا۔ اس کے تجارتی اور کاروباری افراد اتنے کثیر منافع پیدا کر رہے تھے جتنے اس سے پہلے انھوں نے کبھی نہیں کیے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ اب امریکہ کی حکومت بڑے بڑے فوجیوں اور تاجروں کے قبضہ میں تھی۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ۱۹۴۶ء اور ۱۹۴۸ء کے درمیان امریکہ میں کمیونزم کے خلاف جو ہیجان برپا ہوا اس کی شدت کا مقابلہ اگر کمیونسٹوں کے اثر اور طاقت سے کیا جائے تو

معلوم ہوگا کہ ان دونوں کے مابین کوئی نسبت نہ تھی، اگر بفرض محال یہ بھی مان لیا جائے کہ کمیونسٹوں کی نیت واقعی خراب تھی۔ جنگی ساز و سامان کے اعتبار سے ہر شاخ میں روس امریکہ سے بدرجہا کمزور اور کمتر تھا۔ امریکن کمیونسٹ پارٹی کو کبھی کسی ملکی انتخاب میں ایک فی صد سے زیادہ ووٹ نہیں ملے اور یہ ووٹ بھی صرف ایک بار یعنی ۱۹۳۵ء میں ملے تھے۔ اس کے باوجود ایک بھاری بھرکم اور خون خوار روسی ریچھ کی مصیبت سے جو ان کے خیال میں ساری دنیا کے امن و آزادی کا ستیاناس کرنے پر تلا ہوا تھا، اہل امریکہ لرزہ براندام نظر آتے تھے۔ یہ تصور کہ غیر ملکی طاقتوں کے ایجنٹ امریکہ کے غیر مطمئن اور باغی عناصر کے ساتھ مل کر امریکی جمہوریت کا تختہ الٹ دینے کی فکر میں ہیں، امریکی حکمرانوں کا خواب و خور حرام کیے ہوئے تھا۔ امریکہ پر یہ خوف کیوں طاری تھا اور وہ کس امر سے خائف تھا، اس کا جواب روسیوں کے طرز عمل کی روشنی میں نہیں دیا جاسکتا ہے کیوں کہ خوف کا اولین مصدر افراد اقوام کی اپنی شخصی اور اجتماعی بداعمالیوں اور ان سے پیدا ہونے والے احساس گناہ میں پنہاں ہوتا ہے۔ ایک ایسی سرزمین جس کی دولت لامحدود، جس کی طاقت کے آگے چنگیز خانی جلال و جبروت مات تھا، جس کی قومی آمدنی کی کوئی حد و انتہا نہ تھی اور جس کا مستقبل اتنا شاندار نظر آتا تھا کہ اگر اس کے باشندوں پر اس قسم کا خوف طاری ہو جائے تو اس کا سبب خارجی حالات میں نہیں بلکہ داخلی نظام کی خرابیوں میں تلاش کرنا ہوگا۔ امریکی جمہوریت فی الحقیقت آزادی کی وہ بہشت نہ تھی جس کا نقشہ امریکی مصنفوں کی کتابوں میں کھینچا گیا ہے۔ امریکی نظام معیشت میں اعلیٰ اور متوسط طبقوں کو رزق کی فراوانی ضرور حاصل تھی لیکن ان کے ذہن روحانی سکون و اطمینان سے محروم تھے۔ کیوں کہ انھیں اس بات کا احساس تھا کہ یہ بے اندازہ دولت انھیں پاک اور جائز ذرائع سے نہیں مل رہی ہے۔

امریکہ کی متکبرانہ خارجی پالیسی

روز ویلٹ نے روس کے تعلق سے جو بیرونی پالیسی اختیار کی تھی، اگست ۱۹۴۵ء سے اس کا رخ پلٹنا شروع ہوا۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۵ء کو امریکی سیکرٹری آف اسٹیٹ نے اعلان کیا

کہ امریکہ کو بلغاریہ کی موجودہ حکومت کے نمائندہ ہونے میں شک ہے کیوں کہ اس میں ملک کے جمہوری عناصر کو شریک نہیں کیا گیا ہے۔ دو روز کے بعد برطانوی وزیر خارجہ مسٹر بیون نے بھی اسی قسم کا اعلان کرتے ہوئے بتایا کہ بلغاریہ، رومانیہ اور ہنگری میں جو طرز حکومت قائم ہے اس کی موجودگی میں انگلستان کے لیے ان ملکوں سے سفارتی تعلقات قائم رکھنا بہت دشوار ہے۔ بلقان کے ممالک میں جمہوریت کے فقدان کا یہ ماتم کہاں تک حقیقی خلوص پر مبنی تھا اس کا اندازہ اس امر سے ہوسکتا ہے کہ اسپین، پرتگال، ترکی، ایران اور ارجنٹائن وغیرہ میں بھی جمہوری حکومتیں ناپید تھیں لیکن اس کے باوجود امریکہ کو ان حکومتوں پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ بلقان کے ممالک پر امریکہ اور انگلستان کا یہ سب وشتم ایک نئی پالیسی کا آغاز تھا جو یالٹا کے معاہدہ کے بالکل منافی تھی۔ کیوں کہ اس معاہدہ کی رو سے چرچل اور روز ویلٹ دونوں نے دریائے ڈینیوب کے آس پاس کے ممالک پر روس کی سیادت تسلیم کر لی تھی۔ اس لیے ان ممالک کے اندرونی نظم حکومت کا سوال اٹھانے کے یہ معنی تھے کہ برطانیہ اور امریکہ معاہدہ یالٹا کے خلاف بلقان سے روسی اثر مٹانا چاہتے تھے۔

۱۲ مارچ ۱۹۴۷ء کو صدر ٹرومین نے کانگرس سے چالیس کروڑ ڈالر کی رقم کے لیے استدعا کی۔ یہ رقم یونان اور ترکی کی امداد کے لیے مانگی گئی تھی اور وجہ یہ بتائی گئی تھی کہ یونان اور ترکی روسی حملہ یا کمیونسٹ انقلاب کی زد میں ہیں۔ یہ بھی کہا گیا کہ یہ دونوں ممالک جمہوری ہیں اور اس لیے اس عالمگیر کشمکش کے ضمن میں جو جمہوریت اور آمرانہ طرز زندگی کے مابین جاری ہے یہ دونوں امریکی امداد کے مستحق ہیں کیوں کہ امریکہ پر آمریت اور مطلق العنانی کے مقابلہ میں جمہوریت کی حمایت فرض ہے۔ جہاں تک جمہوریت کا تعلق ہے اس وقت تک ترکی پر ایک واحد سیاسی جماعت کی ڈکٹیٹرشپ قائم تھی۔ جولائی ۴۶ء میں جو انتخابات منعقد کیے گئے اور جس میں پہلی مرتبہ حزب مخالف کو شریک ہونے کی اجازت ملی، ان کا انعقاد مارشل لاء کے تحت عمل میں لایا گیا اور تمام مخالف حکومت اخبار بند کر دیے گئے۔ اکثر بیرونی مشاہدین کا بیان ہے کہ ان انتخابات میں ترکی حکومت کی کامیابی طاقت اور دباؤ کے استعمال کا نتیجہ تھی۔

یونانی حکومت کے بارے میں جو انگریزوں کی ساختہ پرداختہ تھی مخالفین کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ ملوکیت پسند اور فاسسطی عناصر کی گٹھ جوڑ سے قائم کی گئی ہے اور انتخابات میں اس کی کامیابی زیادہ تر کمیونزم کے خوف سے عمل میں آئی ہے نہ کہ بادشاہت یا فاسسطی طرز حکومت کی مقبولیت کے باعث۔ ٹرومین کے اس اقدام سے پہلے ستر کروڑ ڈالر کی ایک بیش قیمت رقم یونان پر صرف کی جا چکی تھی لیکن بجائے اس کے کہ اس خرچ سے عوام کی پریشانیاں دور ہوتیں یا مصیبت زدگان جنگ کی امداد عمل میں آتی، اس کا واحد اثر یہ ہوا کہ چور بازاری بڑھ گئی، اسباب تکلفات اور اشیائے تعیش کی درآمد میں غیر معمولی اضافہ ہوا اور چند منافع بازوں اور بڑے بڑے سرکاری عہدہ داروں نے خوب دل کھول کر اپنی جیبیں بھر لیں۔ یونان کی اندرونی حالت یہ تھی کہ اس کی حکومت قیمتوں پر نگرانی اور سکہ کی اصلاح کی تمام تجاویز کو مسترد کر چکی تھی۔ اس کے بجائے وہ پولیس اور فوج میں مزید اضافہ کے لیے رقمی امداد کی طلب گار تھی۔ اس کی ایک لاکھ تیس ہزار فوج تیرہ ہزار باغیوں کی سرکوبی سے عاجز تھی۔ چند ہی روز کے اندر باغیوں کی تعداد پچیس ہزار تک بڑھ گئی۔ رجعت پسند عناصر کی ظالمانہ کارروائیوں نے ہزاروں یونانیوں کو باغیوں کی حمایت پر آمادہ کر دیا اور امریکہ کے عہدہ داروں اور مشیران کار نے جو یونانی حکومت کی رہبری کر رہے تھے ان مظالم سے دیدہ و دانستہ چشم پوشی کر لی۔

اخلاقی جرائم کی شدت و وسعت

ابھی حال میں یعنی ۲ ستمبر ۱۹۵۱ء کو امریکہ کے ایک سابق صدر مسٹر ہربرٹ ہوور نے ایک تقریر کے دوران جو تقریباً تمام اخبارات میں شائع ہو چکی ہے، امریکہ کی اخلاقی حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

''امریکہ کی پبلک لائف میں عقلی بددیانتی نہایت تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ یہی خرابیاں قوموں کو پہلے بھی شکست و بربادی میں مبتلا کر چکی ہیں۔ دنیا کی نجات کے لیے امریکہ کی کوششیں اسی وقت بار آور ہو سکتی ہیں جب کہ پہلے امریکہ اپنے گھر کی برائیوں پر قابو حاصل کرنے میں کامیاب ہو۔ میں جانتا ہوں کہ امریکی کانگرس ایک نئے اخلاقی ضابطہ

کی تلاش میں ہے جو سرکاری عہدہ داروں کے مظالم اور دست درازیوں سے امریکی عوام کی حفاظت کر سکے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اہل امریکہ کے علاج کے لیے ایک اخلاقی ضابطہ سے زاید کسی اور چیز کی ضرورت ہو گی۔''

یہ تقریر ہربرٹ ہوور نے اپنی ۷۷ ویں سالگرہ کے موقع پر کی تھی اور اسے سارے ملک کی نشر گاہوں سے نشر کیا گیا تھا۔ اسی تقریر کے دوران میں آگے چل کر ہوور نے کہا:

''کانگرس ملکی قوانین کی توسیع اس طرح کر سکتی ہے جس سے نئی قسم کی رشوتوں کا سد باب کر دیا جائے لیکن کانگرس ذہنی غداری اور عقلی بد دیانتی کا مقابلہ کیسے کرے گی۔ گزشتہ چند سال کے اندر کانگرس کی کئی کمیٹیوں اور کئی امریکی ریاستوں کی مجالس قانون ساز نے بڑے بڑے اہم عہدہ داروں کے کرتوتوں پر سے پردہ اٹھایا ہے۔ جن لوگوں نے امریکی مملکت کی بنیاد رکھی تھی وہ ان احبا نوازیوں اور بے ایمانیوں پر کیسے شرمسار ہوتے جو سرکاری ٹھیکوں اور قرضوں کی تقسیم کے سلسلہ میں عمل میں آ رہی ہیں یا ہماری اس ناکامی کا کتنا ماتم کرتے کہ ہم جواریوں اور چور بازاری کرنے والوں کی گرفت میں لانے سے معذور ہیں۔ کیوں کہ ان مجرموں نے سرکاری عہدہ داروں کو رشوت کھلا کر اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔ نیز وہ ان خفیہ معاہدوں کے متعلق کیا کہتے جن کے وجود سے پہلے تو مسلسل انکار کیا جاتا رہا لیکن جن کا اب علانیہ اعتراف کیا جا رہا ہے۔ مثلاً ہم نے طہران اور یالٹا میں پچاس کروڑ انسانوں کی آزادی کو روس کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔

یکم ستمبر ۱۹۵۱ء کو واشنگٹن سے ایک اور خبر شائع ہوئی جس میں بتایا گیا ہے کہ امریکی سنات کی مجلس تحقیقات جرائم نے اپنی حالیہ رپورٹ میں بتایا ہے کہ امریکہ میں چھوٹے بڑے مجرمین بڑے پیمانہ پر سرکاری عہدہ داروں کو رشوت کھلا کر قانون کی گرفت سے آزادی حاصل کر لیتے ہیں۔ اس رپورٹ میں ایک ایسی غیر سرکاری مجلس کے قیام کی سفارش کی گئی ہے جس کا کام یہ ہو کہ وہ جرائم اور رشوت ستانیوں کے واقعات کو منظر عام پر لا کر ان کا مناسب تدارک کرے۔

امریکی نظم ونسق میں رشوت ستانیوں اور دوست نوازیوں کا حال بیان کرتے ہوئے والٹر لینگ سیم اپنی کتاب کے صفحہ ۶۸۸۔۶۸۷ پر لکھتا ہے:

جون ۱۹۲۳ء کو امریکی صدر ہارڈنگ الاسکا کے دورہ پر روانہ ہوا۔ روانگی سے قبل اس کی صحت اچھی نہیں تھی۔ الاسکا پہنچ کر وہ بیمار پڑا اور ۱۳ اگست کو جب کہ وہ امریکہ واپس ہو رہا تھا اس کا انتقال ہو گیا۔ ہارڈنگ کی موت کا اصلی سبب تو معلوم نہ ہوسکا لیکن یہ باور کرنے کی وجہ موجود ہے کہ اس کا ذہن عرصہ سے پریشان تھا اور سرکاری عہدہ داروں کی بدعنوانیوں اور بددیانتی کے پیہم واقعات نے جن کا اسی زمانہ میں انکشاف ہوا تھا اس کی ذہنی کوفت میں اور زیادہ اضافہ کر دیا۔

اس قسم کا ایک واقعہ چارلس فوربیس سے متعلق تھا۔ ویٹرانز روجو کا ڈائریکٹر تھا، سنات کی ایک تحقیقاتی مجلس کے بیان کے مطابق فوربیس اپنے سرکاری فرائض کے سلسلہ میں نہایت درجہ اسراف، غفلت اور دیگر بداعمالیوں کا مرتکب ہوا تھا۔ جن کی وجہ سے امریکی حکومت کو مجموعی طور پر بیس کروڑ ڈالر کا نقصان اٹھانا پڑا۔ ایک دوسری تحقیقاتی مجلس نے اٹارنی جنرل ڈاریٹی کے متعلق یہ انکشاف کیا کہ اس نے محکمہ عدالت میں نہایت بدنام اور بداطوار اشخاص بھرلیے تھے۔ مزید برآں اس نے کئی مجرموں کے مقدمات پر دیدہ دانستہ کارروائی کرنے سے گریز کیا۔ جب ڈاریٹی نے مجلس تحقیقات کو اپنے دفتری کاغذات کے معائنہ کی اجازت دینے سے انکار کر دیا تو صدر کولج نے اسے مارچ ۲۴ء میں ملازمت سے برطرف کر دیا۔

لیکن سب سے زیادہ تھوکا فضیحتی ایک اور واقعہ کے سلسلہ میں ہوئی جو امریکی حکومت کے تیل کے محفوظ ذخائر سے متعلق تھا۔ تحقیقات سے یہ معلوم ہوا کہ امریکی صدر ہارڈنگ نے بحریہ کے سیکرٹری ایڈون ڈبی کو ایک سرکاری حکم کے ذریعے اجازت دی کہ (Elk Hills) اور (TeapotDome) میں امریکی حکومت کے تیل کے جو محفوظ ذخیرے موجود تھے، ان کا انتظام وہ وزارت داخلہ کے سیکرٹری البرٹ بی فال کو منتقل کر دے۔ ۱۹۲۲ء میں فال نے بغیر کسی سرکاری اعلان واشتہار کے سن کلیر کو (Teapot Dome) کے

ذخائر اور ایڈورڈ ڈوھنی کو (Elk Hills) کے ذخائر پٹہ پر دے دیئے۔ جب اس معاملت کا راز افشا ہوا تو امریکن رکن سنات تھامس والش کی صدارت میں ایک مجلس تحقیقات منعقد ہوئی۔ اس مجلس کی تحقیقات کے نتیجہ میں معلوم ہوا کہ امریکہ میں سرکاری عہدہ داروں کی بدعنوانیوں کا ایک وسیع جال بچھا ہوا ہے۔ سن کلیر کے متعلق تحقیقات کرنے سے یہ پتہ چلا کہ اس نے انتخابات کے موقع پر جمہوری پارٹی کو اس کی انتخابی سرگرمیوں کے لیے ایک بیش قرار رقم دی تھی۔ یہ بھی دریافت ہوا کہ ڈوھنی نے ۱۹۲۱ء میں فال کو بغیر کسی ضمانت کے ایک لاکھ روپیہ بے سود کا قرضہ دیا تھا۔ اسی طرح فال نے سن کلیر سے پچیس ہزار ڈالر کی رقم قرض لی تھی اور تیل کے کئی تاجروں سے بھی بہت سے تحفے تحائف وصول کیے تھے۔ اس کے بعد ان معاملات کے انکشاف سے قبل ۱۹۲۳ء میں اس نے ملازمت سے استعفا دے کر ایک وسیع جائیداد خرید لی جس کی قیمت اس نے ان نام نہاد قرضوں سے ادا کی تھی جو اس نے سن کلیر اور ڈوھنی سے حاصل کیے تھے۔

استنباط نتائج

جیسا کہ ہم اس کتاب کے حصہ اول میں بتا چکے ہیں قرآن کریم افراد و اقوام کی اخلاقی، معاشی اور سماجی خرابیوں کی بنیادی وجہ یہ بتاتا ہے کہ قومیں اور ان کے افراد تملیکی جذبات کے غلبہ سے متاثر ہو کر حیات برتر کا بلند تصور کھو بیٹھتے ہیں اور زندگی کے کسی ادنیٰ تصور کو اپنی سرگرمیوں کا محور و مرکز قرار دے لیتے ہیں۔ اس ادنیٰ تصور زندگی کو قرآن متاع دنیا سے موسوم کرتا ہے اور حیات برتر کے تصور کو وہ آخرت کے نام سے یاد کرتا ہے۔ کیوں کہ اعلیٰ تصورات کے مطابق زندگی بسر کرنے اور بلند تر مقاصد کے لیے جدوجہد کرنے سے جو نتائج پیدا ہوتے ہیں وہ بہت دیر میں ظاہر ہوتے ہیں یا یوں کہیے کہ ان کے ظہور میں تاخیر ہوتی ہے اور آخرت کا لفظ اسی عمل تاخیر پر دلالت کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن اسی ادنیٰ تصور حیات کا نقشہ کھینچتے ہوئے اور لوگوں کو ایک بہتر اور بلند تر تصور حیات کی طرف دعوت دیتے ہوئے فرماتا ہے:

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَ الْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادِ ○ اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ○ اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَ الْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ (آل عمران : ۳: ۱۴تا۱۷)

لوگوں کے واسطے زینت رکھ دی گئی ہے خواہشات ادنیٰ کی محبت میں جو حسن نسوانی، اولاد، سونے چاندی کے ڈھیروں، نشان زدہ گھوڑوں چوپایوں اور کھیتیوں کی محبت میں ظاہر ہوتی ہے یہ ایک ادنیٰ زندگی کی متاع ہے اور اللہ کے یہاں اس سے بہتر پناہ گاہ ہے۔ کہو کیا میں تمھیں کچھ اس سے بھی بہتر چیزیں بتاؤں جو ان لوگوں کے لیے ہیں جو خدا (کے قانون مکافات عمل) سے ڈرتے ہیں۔ یہ ہیں باغ جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور جن میں پاک بیویاں ہیں اور اللہ کی رضا اور خوشنودی ہے اور اللہ اپنے بندوں کے اعمال سے خوب باخبر ہے۔ یہ چیزیں ان لوگوں کے لیے ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم ایمان لائے تجھ پر، تو ہمارے گناہوں کو معاف فرما اور ہمیں عذاب دوزخ سے بچالے۔ اپنے مقصد کی جدوجہد میں صبر کرنے والے، اپنے اعلانات اور اقوال کو سچ کر دکھانے والے، اپنے مقصد کے اطاعت شعار اور فرمانبردار اور اپنے مقصد کے لیے روپیہ پیسہ خرچ کرنے والے اور صبح کے وقت خدا سے معافی مانگنے والے۔

اس آیت سے یہ ظاہر ہے کہ قرآن کریم مال و دولت کی محبت، اراضی اور جائیداد کی طلب، شہوانی الفت کے شغف وانہماک اور کثرت اولاد کی خواہش کو مجموعی حیثیت سے متاع دنیا قرار دیتا ہے اور جو لوگ صرف انھی چیزوں کے لیے زندگی بسر کرتے ہیں، ان سے کہتا ہے کہ زندگی کے اس سے اعلیٰ تر مدراج اور بلندتر مقاصد بھی موجود ہیں جن کی طرف تمھیں بڑھنا چاہیے۔ پھر وہ ان لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے جو متاع دنیا کی خاطر نہیں بلکہ آخرت یعنی کسی برتر اور دیر طلب تصور حیات کے لیے زندگی گزراتے ہیں، ان صفات کا نقشہ کھینچتا ہے جو آخرت کے طلب گاروں میں پائی جاتی ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ متاع دنیا کے طلبگاروں پر تملکی جذبات کا غلبہ ہوتا ہے اور آخرت یعنی حیات برتر کے متلاشیوں پر تعمیری اور تخلیقی جذبات حاوی ہوتے ہیں۔ کیوں کہ حسن نسوانی سے لذت اندوزی کی خواہش او رزمین و جائیداد یا زروسرمایہ کے حصول کا شوق انسانی پر تملکی جبلتوں کے غالب آجانے سے پیدا ہوتا ہے اور انسان کسی اعلیٰ روحانی مقصد کے لیے اپنا مال وسرمایہ اسی وقت خرچ کرتا ہے

اوراس کی راہ میں صبر اور سچائی کی صفات کا اظہار بھی اسی صورت میں کرتا ہے جب اس پر تخلیقی جذبات اور تعمیری خواہشات پوری طرح تسلط پالیتی ہیں۔

یہی فرق زوال پذیر اور ترقی پذیر قوموں کا بھی ہے۔ جو قومیں روبہ انحطاط ہوتی ہیں ان کے افراد پر زندگی کا کوئی ادنیٰ تصور حاوی ہو جاتا ہے جو ان کے تعمیری جذبات اور تخلیقی جوش کو افسردہ اور تملیکی جذبات کو بیدار کر دیتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دنیوی آسائش کی خواہش، روپیہ پیسہ کی محبت، اولا داز دواج کی حرص، حسن نسوانی کی طلب اور اس سے لذت اندوزی کا شوق، نمود و نمائش کا جذبہ، شان و ترفع کا چسکا اور اسی قسم کے دیگر محرکات ان کی زندگی اور سیرت کی تشکیل کرنے لگتے ہیں۔ اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ جو قومیں مائل بہ ترقی ہوتی ہیں، ان کے افراد تملیکی جذبات سے بالکل خالی ہوتے ہیں۔ البتہ ترقی پذیر قوموں میں تعمیری جذبات اور تخلیقی محرکات خالص تملیکی خواہشات کے مقابلے میں اتنے طاقت ور ہوتے ہیں کہ آخر الذکر صفات کو ابھرنے اور زور کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ کیوں کہ پوری قوم حیات برتر کے کسی نہ کسی تصور میں اس طرح مگن اور سرشار ہوتی ہے کہ تملیکی جذبات زور کرنا چاہیں بھی تو تخلیقی محرکات کا جوش انھیں ایک سیل بے پناہ کی طرح بہا لے جاتا ہے۔

قرآن نے زوال پذیر قوموں کی جن خصوصیات کا تذکرہ کیا ہے اور جن کی تفصیلی کیفیت ہم حصہ اول میں بیان کر چکے ہیں، اگر ان کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ سب ایک اصل کی پیداوار ہیں اور یہ اصل وہی ہے جس کی طرف قرآن کریم نے مذکورہ بالا آیات میں توجہ مبذول کرائی ہے۔ یعنی مال و دولت اور لذت و آسائش کی طلب یا تملیکی جذبات کا شور و شر مثلاً قرآن نے تباہ شدنی اقوام کی اس خصوصیت کا ذکر کیا ہے کہ ان کے اندر شدید قسم کی طبقاتیت پائی جاتی ہے اور ان کے مال دار اور متمول طبقات اپنے غریب اور کمزور ہم قوموں کو حقارت و ذلت کی نظر سے دیکھتے ہیں:

وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ (۱۱:۲۷)

اور ہم نہیں دیکھتے ہیں کہ بجز ذلیل اور حقیر قسم کے لوگوں کے اور کسی نے تیری بات مانی ہو۔

یا اس نے زوال پذیر قوموں کا حال بیان کرتے ہوئے بتایا ہے کہ ان میں استکبار اور اتراف کے اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں یعنی اپنی خوش حالی اور اپنے مال و دولت کا غرور ہوتا ہے اور وہ قوم کے پست تر طبقات یا محکوم اقوام کے مقابلہ میں اپنی شان و شوکت اور دنیوی وجاہت کا اظہار کرنے لگتے ہیں۔ جس سے غریب اور متوسط طبقات کے دلوں میں ایک احساس ذلت پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح قرآن نے ہمیں بتایا ہے کہ آباؤ اجدا کی اندھی تقلید بھی زوال آمادہ قوموں کی ایک صفت ہوتی ہے، پھر قرآن کہتا ہے کہ جو قومیں تباہ ہونے والی ہوتی ہیں، ان کے اندر ظالم و جابر اور غیر منصف مزاج حکمرانوں کا مقابلہ کرنے یا ان کی مزاحمت کرنے کا مادہ فنا ہو جاتا ہے اور وہ ہر قسم کی لیڈر شپ کو خواہ اچھی ہو یا بری طوعاً وکرھاً قبول کرلیا کرتی ہیں۔ اب اگر ان ساری صفات میں کوئی قدر مشترک تلاش کی جائے اور ان کا کوئی واحد قانون دریافت کیا جائے جس سے یہ مختلف صورتوں میں سرزرد ہوتی ہیں تو معلوم ہوگا کہ درحقیقت یہ مختلف صفات اور متفرق کمزوریاں اسی ایک اصل سے پیدا ہوتی ہیں جس کو قرآن حب الشھوات سے تعبیر کرتا ہے۔ بالفاظ دیگر تملکی جذبات کا غلبہ قوموں کے اندر یہ تمام کمزوریاں پیدا کرتا ہے۔ جب تک قوم میں تعمیری اور تخلیقی جذبات کا پلہ بھاری رہتا ہے، نہ دولت مندوں میں غرور استکبار کی صفت پائی جاتی ہے اور نہ غریبوں میں احساس کمتری کا کوئی شائبہ نظر آتا ہے کیوں کہ وہ سب مل کر ایک مشترکہ تخلیقی مقصد کے لیے جدوجہد کر رہے ہوتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ ایسی مشترکہ جدوجہد کے دوران میں اونچ نیچ، غریبی امیری اور چھوٹے بڑے کا سوال نہیں پیدا ہوسکتا ۔ اسی طرح تقلید آبا اور جمہور کے اوصاف جو عقل وفکر کی قوتوں کے ضعف کی وجہ سے رونما ہوتے ہیں، اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ اب افراد قوم کے سامنے کوئی تخلیقی مقصد نہیں رہا ہے جو انھیں قوائے عقلی کے استعمال پر ابھارے اور بدلتے ہوئے حالات میں حصول مقصد کے نئے نئے ذرائع اور وسائل تلاش کرنے پر مجبور کرے۔ غلط لیڈروں اور جابر و سرکش سلطنتوں کے آگے سر تسلیم خم کر دینے کا مرض بھی اصل میں تملکی جذبات کے فروغ سے پیدا ہوتا ہے۔ جب لوگوں

میں مال و دولت اور دنیوی اعزازت ومناصب کی الفت بڑھ جاتی ہے تو ملک کے معاشی وسائل پر قبضہ واقتدار رکھنے والے افراد وطبقات ان کی حرص وہوس اور زرطلبی سے فائدہ اٹھا کر اوران میں روپیہ پیسہ، عہدے اور مناصب تقسیم کرکے انھیں ضمیر فروشی پر آمادہ کر لیتے ہیں۔ گزشتہ زمانہ میں چونکہ معاشی قوت اور فوجی طاقت لازم وملزوم تھی، اس لیے جولوگ فوجی حیثیت سے طاقت ور ہوتے تھے انھی کے ہاتھ میں ملک کے معاشی وسائل بھی ہوتے تھے اور یہی لوگ سوسائٹی کے ہنگامہ خیز اور فاعلانہ عناصر کو روپیہ پیسہ اور رشوتیں کھلا کر یا ڈرا دھمکا کر اپنا ہمنوا بنا لیتے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ وہ دیدہ ودانستہ ان کی غلط اور مضرت رساں پالیسی کی تائید کرکے ضمیر فروشی کرتے تھے اور اپنے اعلیٰ تر جذبات قومی یا احساسات مذھبی کو دبا دیتے تھے۔ جب تک قوم کا ضمیر بیدار رہتا ہے اور اس کے افراد قومی اور اخلاقی فواید کے مقابلہ میں دنیوی عزت، عہدوں اور مال ودولت کی پروا نہیں کرتے اس وقت تک کوئی جابر حکمران یا غلط قسم کا سیاسی لیڈر ان کا امیر اور قائد نہیں بن سکتا۔ اس طرح یہ ظاہر ہے کہ زوال پذیر قوموں کی تمام صفات رذیلہ بالآخر ایک ہی اصل اور سرچشمہ سے پھوٹتی اور ظاہر ہوتی ہیں یعنی تملکی جذبات کی شدت اور افراد پر ان کا قہرمانہ تسلط۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ رومی اور مغربی تہذیب کے جو حالات ہم نے اوپر بیان کیے ہیں ان سے قرآن کریم کے اس نقطہ نظر کی کہاں تک تصدیق ہوتی ہے اور قرآن کے بیان کردہ قوانین تاریخ کا اطلاق رومیوں اور مغربی قوموں پر کہاں تک عمل میں آ سکتا ہے۔

جہاں تک سلطنت روما کا تعلق ہے اس کی اخلاقی کمزوریاں جولیس سیزر ماریس اور سلا کے زمانہ سے منظر عام پر آنا شروع ہوئیں، اس سے قبل روم کا ہر فرد اپنے ملک کا سپاہی تھا اور محض روپیہ یا شہرت واعزاز کی خاطر یہ کام نہیں کرتا تھا جیسا کہ گبن کے بیان سے ظاہر ہے۔ رومی سلطنت کی توسیع سے قبل رومیوں میں انفاق مال یعنی اجتماعی ضروریات کے لیے اپنی دولت خرچ کرنے کا اتنا جوش تھا کہ انھوں نے بغیر کسی خارجی جبر اور دباؤ کے پوری رضا و رغبت کے ساتھ رومی افواج کے اخراجات ومصارف کا بار اپنے سر لے لیا

حالانکہ ان کی معاشی حالت ابھی تک نہایت کمزور تھی لیکن ماریس سلا سیزر کے زمانہ میں یہ صورت حال باقی نہیں رہی۔ ان آمروں کے قبضہ اقتدار میں ایک پیشہ ور اور زر پرست فوج تھی جس کو بیش قرار تنخواہیں اور بڑے بڑے اعزازات و مناصب دے کر یہ لوگ اپنے ذاتی مفاد کے لیے کام میں لانے لگے تھے۔ اس کے معنی یہ تھے کہ اب روم کے شہری قومی اغراض یا تخلیقی مقاصد کے لیے نہیں بلکہ اپنی ذاتی بڑائی، ترقی اور خوشحالی کے جذبہ سے متاثر ہو کر کام کرنے لگے تھے اور ان میں یہ قابلیت اور دیانت باقی نہیں رہی تھی کہ جن مقاصد سے قوم کا مجموعی مفاد وابستہ نہ ہو ان کے لیے محض روپیہ پیسہ اور دولت و اعزاز کی خاطر اپنا خون پسینہ بہانے سے انکار کر دیں۔ اس طرح دولت دنیوی اعزاز و اکرام کی طلب یا قرآنی اصطلاح میں حب الشھوات نے قوم کے شجاع اور جنگجو افراد پر اتنا غلبہ پا لیا تھا کہ روم کے ان تینوں ڈکٹیٹروں نے نہایت آسانی سے انھیں اپنے ذاتی اور گروہی اغراض کے آلہ کار کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا۔

رومی ذہنیت میں یہ انقلاب کیوں کر پیدا ہوا اور رومی قوم تعمیری جذبات سے عاری ہو کر تملیکی جذبات کا کیوں شکار ہو گئی اس کی وجہ وہی تھی جس کی طرف قرآن نے توجہ مبذول کرائی ہے یعنی مال و دولت کی کثرت اور اتراف یعنی خوش حالی کا غرور۔ جب سے روم کو پے در پے فوجی فتوحات نصیب ہونی شروع ہوئیں اس ملک میں مفتوحہ علاقوں کی دولت کھنچ کھنچ رجمع ہونے لگی۔ رومی سپاہی جو ابتدا میں کاشت کاری کا پیشہ کرتے تھے اب دولت اور فوجی مناصب و اعزازات کے غرور میں مبتلا ہو کر زراعت اور کھیتی کے پیشہ کو ذلیل سمجھنے لگے، اس لیے انھوں نے اپنی اراضی امیروں کے ہاتھ فروخت کر دی اور خود مال غنیمت اور سرکاری تنخواہوں پر زندگی بسر کرنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ روما کے ملک میں چھوٹے چھوٹے کسانوں کا وجود عملاً ختم ہو گیا اور ان کی تمام زمینیں مال دار افراد کے ہاتھ میں آ گئیں جس سے زمینداروں اور جاگیرداروں کا ایک مفت خور طبقہ پیدا ہو گیا۔ رومی سنات کے متمول ارکان نے چھوٹی چھوٹی زمینوں کو خرید کر انھیں بڑی بڑی جاگیروں میں تبدیل کر دیا اور مفتوحہ

ممالک سے جولاتعداد غلام روم میں داخل ہوگئے تھے ان سے ان جاگیرات پر مفت کام لینے لگے۔اس طرح روم میں رفتہ رفتہ طبقاتیت کی وہ شدت پیدا ہوگئی جس کو قرآن کریم نے زوال پذیر قوموں کا ایک نمایاں وصف قرار دیا ہے۔اسی طبقاتیت کی خرابیوں کا قلع قمع کرنے کے لیے ٹائیلبیر یس گریکس نے ۱۳۳ء میں جب کہ وہ ٹرائیبیون کی خدمت پر مامور ہوا بڑی سخت جدوجہد کی لیکن رومی سنات کے جاگیردار ارکان کی مخالفت نے اس کی تمام تدابیر اور کوششوں کو ناکام بنادیا بلکہ انھی لوگوں کی عداوت اور سازشوں کی وجہ سے اسے ایک ہنگامہ کے دوران قتل کر دیا گیا۔ادھر ٹائبیر یس اور اس کا بھائی گائیس گریکس روم کی بڑھتی ہوئی طبقاتیت کے خلاف جدوجہد کر رہے تھے، ادھر بروٹس اور دوسرے جمہوریت پسند عناصر جولیس سیزر وغیرہ کی ترقی پذیر آمریت کا مقابلہ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔

جولیس سیزر کے بعد جب اس کا بھتیجا آغسطس تخت نشین ہوا تو اس نے جمہوری روایات کا ظاہری احترام رکھتے ہوئے سلطنت کو بالکل آمرانہ طرز پر ڈھال لیا۔رومی تاریخ کے اس دور میں اگرچہ سلطنت پر آثار زوال طاری ہوگئے تھے۔لیکن چوں کہ اس کے مقابلہ کی کوئی قوم دنیا بھر میں موجود نہ تھی اس لیے وہ عرصہ دراز تک تباہی سے محفوظ رہی کیوں کہ ابھی تک رومی سوسائٹی بروٹس اور گریکس برادران جیسے اشخاص سے خالی نہیں تھی جو ہر قسم کے خطرات اور نقصانات کا سامنا کر کے وقت کی برائیوں اور حکومت کی خرابیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کو تیار تھے، یہاں تک کہ قوم کی اصلاح کے لیے وہ اپنی جان کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے۔جب تک کسی قوم میں یہ صفت باقی رہتی ہے کہ اس کے ایمان دار اور صالح افراد گرد و پیش کی برائیوں کو خاموشی سے گوارا نہیں کرتے اور نہ مسجدوں یا خانقاہوں میں گوشہ نشینی اختیار کرتے ہیں بلکہ ان کے خلاف زبان وقلم اور جان و مال سے جہاد کرتے رہتے ہیں اس وقت تک کوئی بھی قوم زوال و بربادی سے محفوظ رہتی ہے۔اسی بات کو قرآن کریم نے یوں بیان فرمایا ہے:

فَلَوْ لَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ اِلَّا

قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ (۱۱:۱۱٦)

پھر تم سے پہلی آبادیوں میں اچھے عمل والے لوگ کیوں نہ ہوئے جو ملک میں لوگوں کو فساد اور بداعمالی سے روکتے۔ البتہ تھوڑے لوگ ایسے تھے جنھیں ہم نے نجات دی لیکن عام طور پر جو لوگ ظالم تھے وہ ان آسائشوں کے پیچھے پڑے رہے جو انھیں دی گئیں تھیں اور یہی لوگ مجرم تھے۔

قرآن کریم کے اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو قومیں تباہ ہونے والی ہوتی ہیں ان میں ایسے اشخاص کی تعداد بہت کم رہ جاتی ہے جو اپنی قوم اور بالخصوص اس کے مال دار اور خوش حال طبقات کو ظلم و ستم اور عیش و عشرت سے روک کر صحیح راستہ پر لا سکیں۔ چنانچہ آگے چل کر رومی قوم کا بھی یہی حال ہوگیا کہ اس میں نہ تو کوئی بروٹس پیدا ہوسکا جو رومی شہنشاہوں کو مطلق العنانی سے روکتا اور نہ کوئی ٹائیریس یا گائیس گریکس میدان عمل میں آیا جو روم کے مال دار طبقات کو معاشی ظلم و ستم اور عیش پرستی کی عادات پر تنبیہ اور تہدید کرتا۔

گبن کے بیان کے مطابق آغسطس نے اپنے عہد حکومت میں جمہوری روایات اور ادارہ جات کا بڑا احترام ملحوظ رکھا لیکن یہ محض دھوکا تھا۔ آغسطس نے دراصل اپنی حکومت کی بنیاد آمریت اور مطلق العنانی کے اصولوں پر استوار کی تھی اور جمہوریت کی روح روم کے باشندوں میں بالکل فنا ہوچکی تھی۔ یہ صورت حال اسی ظاہر پرستی سے وجود میں آئی تھی جو زوال پذیر قوموں کو ظواہر و شعائر کی پرستش میں گرفتار کر کے انھیں قومی اور مذہبی اصولوں کی روح اور قوانین و ضوابط کے اصلی مقصد و منشا سے بیگانہ کر دیتی ہے۔ ظاہر پرستی کی یہ علامات مذہب و اخلاق کے شعبہ کی طرح سیاست و معیشت اور تمدنی زندگی کے دائروں میں بھی پیدا ہوسکتی ہیں۔ چنانچہ روم کے سیاسی نظام کا روگ بھی یہی تھا کہ بظاہر اس کا طرز و انداز جمہوری تھا۔ لیکن حقیقت میں اس کا خمیر مطلق العنانی اور آمریت سے تیار ہوا تھا۔ سنات کی طاقت برائے نام رہ گئی تھی۔ روم کے مجسٹریٹوں اور دوسرے جمہوری عہدہ داروں کا کوئی اختیار و اقتدار باقی نہیں رہا تھا، ساری طاقت آغسطس کے ہاتھ میں تھی جو اپنے آپ کو پرنسپس

یعنی پہلا شہری کہا کرتا تھا لیکن اصل میں ایک مطلق العنان اور جابر حکمران تھا۔ یہی بات ہم نے فرانس کے حالات میں بھی بیان کی ہے۔ اس ملک میں بھی ۱۹۴۰ء کی شکست سے قبل صرف ایک ظاہری اور رسمی جمہوریت باقی رہ گئی تھی۔ اصل اقتدار چند بڑے بڑے بینک کاروں کے ہاتھ میں تھا۔ ویسے تو فرانس میں پارلیمنٹ بھی موجود تھی۔ سیاسی پارٹیاں بھی کام کر رہی تھیں۔ وقتاً فوقتاً انتخابات بھی منعقد ہوا کرتے تھے اور بظاہر فرانس کا پریس بھی آزاد تھا لیکن ان سارے اداروں کے اندر کوئی حقیقت اور اصلیت باقی نہ تھی۔ یہی حالت آج خود ہماری اپنی قوم کی بھی ہے۔ ہمارا دین چند خارجی رسوم وضوابط اور ظاہری عبادات و شعائر کا مجموعہ بن گیا ہے۔ ویسے تو ہمارے یہاں نماز اور روزوں کا کافی چرچا ہے۔ مذہبی قوانین کی ظاہری پابندی بھی کی جاتی ہے۔ میلاد کی محفلیں بھی منعقد ہوتی ہیں۔ یوم عمرؓ، یوم صدیقؓ، یوم علیؓ اور یوم حسینؓ بھی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے لیکن یہ سب ظاہری پردے ہیں جن کو اٹھا دیا جائے تو معلوم ہوگا کہ دین داری کی اصل روح اور تقویٰ کی اصل حقیقت ہمارے اندر سے فنا ہو چکی ہے۔ اسی وجہ سے ہم قوانین مذہب کے مقصد ومنشا کو اہمیت دینے کے بجائے ان کے ظاہری الفاظ سے چمٹے ہوئے ہیں اور بزعم خود یہ سمجھتے ہیں کہ ان قوانین کی رسمی پابندی سے ہماری قوم کو دنیا اور آخرت دونوں جگہ نجات مل جائے گی۔

رومی تاریخ میں حب الشہوات کا ایک اور مظاہرہ اس وقت عمل میں آیا جب جنسی خواہشات کے غلبہ نے روم کے بادشاہوں اور امیروں کو اپنی بیویوں اور داشتہ عورتوں کا آلہ کار بنا دیا۔ یہ کیفیت انطونی کے وقت سے شروع ہو گئی تھی جس کی عشق و عاشقی کے افسانے زبان زد عام تھے۔ حسن نسوانی کی دنیا میں قلوپطرہ کو جو شہرت دوام حاصل ہوئی وہ اسی رنگین مزاج رومی حاکم کا عطیہ تھا۔ اس کے بعد ہم نے دیکھا کہ آغسطس نے محض اپنی بیوی کے عشق میں سلطنت کی جانشینی کے مسئلہ کو ایک عورت کی مرضی کے سپرد کر دیا۔ پھر کموڈس نے حسن و عشق کی دنیا میں جو یادگاریں چھوڑیں ان سے رومی تاریخ کے صفحات اب تک مزین ہیں۔ غرض کہ جیسا جیسا زمانہ گزرتا گیا روم کے امرا اور عوام دونوں پر شہوانی جذبات کا تسلط

بڑھتا گیا اور ان کا جنسی اخلاق روز بروز گرتا گیا یہاں تک کہ رومی مورخ ٹیسی ٹس روم کے بڑے بڑے خاندانوں کے تعیش اور شہوت پرستی کا حال بیان کر کے حسرت سے کہتا ہے کہ جرمنی کے وحشی قبائل کی عورتیں رومی شرفا کی عورتوں کے مقابلہ میں عفت و پاک دامنی اور عصمت و پرہیز گاری کا نمونہ ہیں۔ شہوت پرستی کی یہ وبا قوموں میں اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب ان کی دولت و ثروت میں خوب اضافہ ہو جاتا ہے اور لوگوں کی آمدنیاں ان کی حقیقی ضروریات سے بہت زیادہ بڑھ جاتی ہیں۔ چوں کہ لوگوں کے اندر تعمیر و تخلیق کا جذبہ باقی نہیں ہوتا، اس لیے وہ اپنی زاید دولت کو قومی اور اجتماعی ضروریات پر صرف کرنے کے بجائے مزید آمدنی پیدا کرنے میں استعمال کرتے ہیں یا اپنے فاضل روپیہ پیسہ کو زینت و آرائش اور شہوت پرستی پر خرچ کرتے ہیں۔ ایسے ہی زمانہ میں رقص و سرود کی محفلیں خوب زور شور سے گرم ہوتی ہیں، بے فائدہ کھیلوں اور تماشوں کی کثرت ہوتی ہے، زینت و آرائش اور عیش و عشرت کے تمام اسباب و وسائل خوب ترقی کرتے ہیں۔ کیوں کہ ان سب چیزوں کی کثرت درحقیقت انسان کے جذبہ شہوانی کی بے راہ روی سے ظہور میں آتی ہے۔ جب تک تعمیر و تخلیق کا جوش قوموں پر غالب رہتا ہے، اس کے اثر سے ان کے شہوانی اور تملکی جذبات میں اعتدال قائم رہتا ہے۔ ناچ اور رنگ، کھیل اور تماشے اور زینت و آرائش کے تمام مظاہر حد اعتدال سے آگے نہیں بڑھنے پاتے لیکن جب دولت کی کثرت اور مال کی محبت کے باعث قوم کی تخلیقی امنگیں سرد پڑ جاتی ہیں تو عیش و عشرت اور بوالہوسی اور شہوانیت کا سیلاب پھوٹ پڑتا ہے۔ اسباب عیش اور وسائل زینت کو خوب ترقی ہوتی ہے اور قوم کی زندگی تعمیر و تخلیق کی ایک مسلسل جدوجہد کے بجائے عیش طلبی اور لذت پرستی کی ایک طولانی داستان بن جاتی ہے۔ پھر اس کے اثرات قوم کی سیاسی اور معاشی زندگی پر بھی پڑنے لگتے ہیں۔ اسلامی تاریخ میں شہوت پرستی کے یہ تمام مظاہر و علامات اور عورتوں کا سیاست میں عمل دخل اسی وقت شروع ہوا جب کہ مسلمانوں کی سلطنت وسیع ہو گئی اور ان کی دولت و خوش حالی میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا۔ بنو امیہ کے دور تک ہمیں اسلامی تاریخ میں کوئی ایسی مثال نہیں ملتی کہ کسی خلیفہ نے حسن نسوانی

کے اثرات کو سلطنت کے مسائل میں داخل کیا ہو۔ اس قسم کا پہلا واقعہ عباسیوں کے دور میں ہوا جب کہ ہارون الرشید کی بیوی زبیدہ سلطنت کے معاملات میں دخیل ہونے لگی۔ اس کے بعد جوں جوں زمانہ گزرتا گیا عباسی خلفا کی بیویاں اور لونڈیاں ان کی سیاست پر اثر انداز ہونے لگیں۔ انگلستان کی تاریخ سے بھی ہمارے اس دعویٰ کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس ملک کی سیاسیات میں ۱۹۱۸ء تک عورتوں کا کوئی دخل نہ تھا۔ ۱۹۱۸ء میں پہلی مرتبہ انگلستان میں تیس سال سے زاید عمر کی عورتوں کو حق رائے دہی دیا گیا پھر ۱۹۲۸ء میں اس حق کی توسیع کی گئی اور ۲۱ سال یا اس سے زیادہ عمر والی عورتوں کو بھی انتخابات میں رائے دینے کی اجازت دی گئی۔ اس طرح انگلستان کی تاریخ کے اس عہد میں جو اس کے اصلی فروغ و ترقی کا زمانہ تھا عورتیں سیاست سے الگ رہیں لیکن جب انگلستان پر زوال اور انحطاط کا دور شروع ہوا تو اس ملک کی عورتیں براہ راست سیاست کے میدان میں اتر آئیں۔ یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ عورتوں کے سیاست میں حصہ لینے یا نہ لینے سے قوم بگڑتی یا بنتی ہے کیوں کہ فرانس میں آخر وقت تک عورتوں کو حق رائے دہی نہیں دیا گیا، اس کے باوجود فرانس زوال و تباہی کی مصیبت سے محفوظ نہ رہ سکا۔ اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ عورتوں کا سیاست میں حصہ لینا یا نہ لینا قومی زوال کے موجبات میں سے ہے یا نہیں بلکہ دعویٰ یہ ہے کہ جب کسی قوم پر شہوانی جذبات کا غلبہ ہو جاتا ہے تو اس کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حکومت کی پالیسی میں نسوانی اثرات داخل ہو جاتے ہیں اور اہم معاملات کے تصفیہ میں حکمران گروہ ملکی مفاد اور قومی اغراض کے بجائے اپنے شہوانی علائق اور نسوانی تعلقات سے متاثر ہونے لگتا ہے جس کی وجہ سے اس کی سیاست ایمان دارانہ نہیں رہتی۔ اگر قوم پر شہوانی جذبات کا غلبہ نہ ہو اور وہ بدستور تعمیری اور تخلیقی امنگوں سے سرشار رہے تو سیاست اور معیشت کے میدان میں عورتوں کے داخلہ سے وہ برے نتائج اور اثرات نہیں پیدا ہوتے جن کا مظاہرہ روما کی تاریخ، مسلمان سلاطین کی سیاست اور فرانس کی حالیہ شکست کے واقعات میں ہو چکا ہے۔

رومی تاریخ کے آخری دور میں ہم نے دیکھا کہ کس طرح اس شجاع اور بلند ہمت قوم

کے افراد مال و دولت کی کثرت، اسباب عیش و زینت کی فراوانی اور شہوت پرستی کی عادات کے باعث اتنے کمزور اور بزدل ہو گئے کہ وہ وحشی جرمنوں کے مقابلہ میں اپنی سلطنت کی مدافعت کرنے کے قابل نہیں رہے۔ حالانکہ یہ وحشی جرمن قبائل معاشی حیثیت سے مفلس، فوجی اعتبار سے غیر مسلح اور تہذیب و تمدن کے نقطہ نظر سے پسماندہ تھے۔ لیکن چوں کہ ان کی زندگی میں سادگی تھی اور وہ عیش و عشرت سے ناآشنا ہونے کے باعث سخت جان، جفاکش اور جنگ جو تھے، اس لیے وہ رومیوں کی کثرت اور طاقت کے باوجود رفتہ رفتہ ان پر غالب آ گئے۔ پہلے تو رومیوں کو اپنی سرحدات کی حفاظت کے لیے انھی اقوام کے نوجوانوں کو اپنی فوج میں بھرتی کرنا پڑا۔ پھر جب فوج میں وحشی جرمنوں کی تعداد بڑھ گئی اور ان کو آرام و آسائش کے وہی وسائل حاصل ہو گئے جو رومیوں کو حاصل تھے تو ان کے اندر بھی پہلی سی فوجی طاقت باقی نہیں رہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رومیوں کے یہ زر خرید سپاہی بھی سلطنت کو اندرون جرمنی کے وحشی قبائل کے حملوں سے نہ بچا سکے۔ بلکہ ان کے ساتھ مل کر انھوں نے سلطنت روما کا خاتمہ کر دیا۔ اس غریب، غیر متمدن، جفاکش، مال و دولت سے محروم اور اسباب عیش و زینت سے ناآشنا قوم کی رومیوں کے بالمقابل وہی حالت تھی جو فرعون اور اس کی مال دار اور عیش پرست قوم کے مقابلہ میں حضرت موسیٰؑ اور ان کی بے مایہ قوم کی تھی اور یہ لوگ بھی رومیوں کے غرور نخوت اور ان کے استکبار کا جواب انھی الفاظ میں دے سکتے تھے جن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر اس کی شکست کی پیشین گوئی کی تھی۔

رَبَّنَآ اِنَّکَ اٰتَیْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَہٗ زِیْنَۃً وَّاَمْوَالًا فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا رَبَّنَا لِیُضِلُّوْا عَنْ سَبِیْلِکَ (۱۰:۸۸)

اے ہمارے رب تو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو دنیوی زندگی کی دولت اور زینت عطا کی ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ تو انھیں اپنے راستے سے دور ہٹا دے۔

اور بالکل انھی الفاظ میں چین کے موجودہ کمیونسٹ جو معاشی حیثیت سے کمزور، فوجی حیثیت سے غیر مسلح، اسباب زینت کے نقطہ نظر سے بے مایہ اور سامان عیش کے لحاظ سے تہی

دامن ہیں، امریکہ اور برطانیہ کی فرعونی طاقتوں سے کہہ سکتے ہیں:

رَبَّنَآ اِنَّکَ اٰتَیْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَہٗ زِیْنَۃً وَّاَمْوَالًا فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا رَبَّنَا لِیُضِلُّوْا عَنْ سَبِیْلِکَ(۱۰:۸۸)

اے ہمارے رب تو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو دنیوی زندگی کی دولت اور زینت عطا کی ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ تو انھیں اپنے راستے سے دور ہٹا دے۔

دولت اور کثرت عیش کی وجہ سے قومیں سچائی کی راہ سے بھٹک جاتی ہیں کیوں کہ دولت منداور خوشحال قومیں ہمیشہ معاملات کے تصفیہ اور حالات کے جائزہ میں اخلاقی عوامل کو نظر انداز کر دیتی ہیں۔ مادی اور معاشی عوامل کو مبالغہ آمیز اہمیت دینے کی وجہ سے ان قوموں کی سیاست بھی بگڑ جاتی ہے۔ مالی اور اقتصادی طاقت کے غرور میں ایسی قومیں انسانوں کے اصلی اخلاقی اوصاف کو جن پر کامیابی اور ناکامی کا دارو مدار ہوتا ہے بہت کم اہمیت دیتی ہیں۔ ان کا نقطہ نظر جس طرح معاشرت اور اخلاق کے مسائل میں غلط ہوتا ہے، اسی طرح واقعات تاریخ اور احوال سیاست کی سوجھ بوجھ بھی ان میں کم ہو جاتی ہے کیوں کہ وہ غلطی سے یہ سمجھ بیٹھتی ہیں کہ معاشی وسائل کی کثرت اور آلات حرب کی فراوانی سے عقیدہ کی کمزوری اور اخلاقی خرابیوں کی تلافی ہو سکتی ہے۔ حالانکہ اخلاق کی کمزوریوں اور عقیدہ کی کوتاہیوں کا کوئی بدل آج تک نہیں پیدا کیا جا سکا اور نہ آئندہ کوئی پیدا کر سکتا ہے۔

رومی تہذیب کے دور زوال میں جو خرابیاں پیدا ہوئیں انھوں نے رومی سلطنت کو یک دم تباہ نہیں کیا بلکہ یہ عظیم الشان قوم عرصہ دراز تک زمین کے ایک حصہ پر حکمران رہی۔ رومی سلطنت کے دیر پا ہونے کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ رومی قوم ان قومی اور نسلی تعصبات سے آزاد تھی جن میں آج کل کی مغربی اقوام مبتلا ہیں۔ رومی اپنی محکوم اقوام کو سیاسی اور معاشرتی حقوق عطا کرنے میں بڑے فیاض تھے۔ چنانچہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ۲۰۱ء میں کیراکلا نے تمام صوبوں کے باشندوں کو رومی شہریت کا حق دیا جس کے بعد وہ جوق در جوق رومیوں کے فوجی اور سول عہدوں پر مامور ہوتے چلے گئے۔ اسی طرح ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ

شہنشاہوں کے انتخاب میں بھی رومیوں نے کالے گورے یا رومی اور غیر رومی کا تعصب نہیں برتا۔ ان کا ایک شہنشاہ شامی، ایک عرب اور ایک افریقی تھا۔ کئی ایک رومی فرمانروا اسپین کی سرزمین سے تعلق رکھتے تھے۔ اس طرح جب رومیوں کی ذہنی اور سیاسی صلاحیتیں کمزور پڑیں تو سلطنت کی محکوم اقوام کے قابل افراد ان کی تہذیب وتمدن اور ان کی حکومت کی خدمت کے لیے آگے بڑھ آئے۔ اگر رومی ان لوگوں کو یکساں مواقع نہ دیتے یا ان سے مساوات کا سلوک نہ کرتے تو رومی سلطنت بہت جلد اپنی اندرونی خرابیوں کا شکار ہو جاتی۔ یہی بات مسلمانوں کے متعلق بھی صحیح ہے۔ اگر اسلام نے عرب اور عجم کا فرق کیا ہوتا اور مسلمانوں کے معاشرہ میں کالے گورے یا خون اور نسل کا امتیاز برتا جاتا یا غیر عرب مسلمانوں کو عربی مسلمانوں کے مساوی درجہ نہ ملتا تو بنو امیہ کے بعد اسلامی تہذیب وتمدن کا خاتمہ ہو جاتا۔ ایرانیوں، ترکوں اور مغلوں کے دائرہ اسلام میں داخل ہونے سے اسلامی تہذیب کو جو فوائد حاصل ہوئے اور ان قوموں کے قابل افراد نے اسلام کی جو خدمات انجام دیں ان کا تاریخ میں کوئی نشان نہ ہوتا، اگر اسلام نے اپنے دین کو قومی اور نسلی امتیازات سے پاک نہ کر دیا ہوتا۔ بشمول امریکہ مغرب کی جدید اقوام پر اتنی جلد زوال آ جانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان قوموں میں مساوات کی وہ اسپرٹ نہیں پائی جاتی جو مسلمانوں اور رومیوں میں موجود تھی۔ اس کے برخلاف ان قوموں میں نسلی اور ملکی تعصبات کا بڑا زور ہے اور یہ لوگ کسی صورت میں بھی محکوم اقوام کے ساتھ احترام وعزت اور مساوات کا سلوک کرنے پر تیار نہیں ہوتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قوموں کے عروج و زوال اور تہذیبوں کی ترقی اور پستی میں ایک فیصلہ کن عنصر یہ ہوتا ہے کہ آیا کوئی تہذیب وتمدن قومی اور نسلی بنیادوں پر قائم ہے یا بین الاقوامی بنیادوں پر یعنی اقوام غیر کے لیے اس کی گود وسیع ہے یا تنگ۔ جس تہذیب کے علم بردار غیر اقوام اور نسلوں کی امداد وتعاون کا خیر مقدم کرتے ہیں اور ان کے ساتھ مساوات اور اخوت کا سلوک کرتے ہیں ان کی تہذیب اور سلطنت دیر تک قائم رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے نسل وخوں اور رنگ وقوم کے

امتیازات اٹھا دیئے اور اپنا دروازہ ہر قوم اور ہر نسل کے انسانوں کے لیے کھلا رکھا تاکہ کسی مخصوص قوم کے زوال پذیر یا تباہ و برباد ہونے سے اسلام کے مستقبل کو کوئی دھچکا نہ پہنچے۔ جب تک مسلمان اس وسیع النظری اور روح مساوات کا مظاہرہ کرتے رہے اور اسلام لانے کے بعد غیر قومیں ان کے مساویانہ سلوک کی وجہ سے اپنے مرتبہ اور عزت میں نمایاں ترقی محسوس کرتی رہیں اس وقت تک مسلمانوں کی تہذیب ہر قوم کے بہترین افراد کی خدمات سے مستفید ہوتی رہی اور ان کی حکومت باوجود ہزار ہا خرابیوں اور بے شمار کمزوریوں کے زمین کے غالب حصہ پر قائم رہی۔

مغربی ممالک کے جو حالات ہم نے گزشتہ صفحات میں بیان کیے ہیں اگر ان کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ قرآن نے اقوام وملل کے زوال وانحطاط کی جو توجیہہ اقوام ماسبق اور اپنے زمانہ کی تاریخ کے حوالہ سے کی ہے، اس کا اطلاق موجودہ اقوام کی تاریخ پر بھی ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں ہم پہلے فرانس کی حالیہ شکست کے اسباب سے بحث کریں گے جیسا کہ جنرل ڈیگال نے بجا طور پر اصرار کیا۔ فرانس کی شکست کی ذمہ داری تنہا فوجی عہدہ داروں پر نہیں بلکہ اس کے نظام و تعلیم و تربیت پر تھی۔ فرانس میں ایک عرصہ سے قومی جذبات سرد اور قومی عقاید کمزور پڑ گئے تھے اور فرانسیسیوں کی نئی نسل کو صرف پیٹ پالنے اور عہدے حاصل کرنے کے لیے مدارس اور کالجوں میں تعلیم دی جا رہی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرانسیسیوں کے ذہن میں اپنی قومی زندگی کی اہمیت کا کوئی تصور نہ تھا۔ وہ زندگی کے مادی اور لذتی تصور کے سوا کسی اور تصور حیات سے ناآشنا تھے۔ پھر جس قوم کے نوجوانوں کا عقیدہ یہ ہو کہ ہم صرف کھانے پینے، سیر و تفریح کرنے، شہوانی لذات سے لطف اندوز ہونے، عہدے اور ترقیاں حاصل کرنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں اس میں ایثار نفس، جفاکشی اور جان و مال کی قربانی کی صلاحیت کیسے باقی رہ سکتی ہے اور وہ اقوام وملل کی کشاکش اور تصادم میں کس طرح کامیاب ہو سکتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قومی زندگی کے لیے یہ ضروری ہے کہ افراد قوم میں تعلیم و تربیت، پروپاگنڈا اور شخصی کردار کی مثال سے کوئی ایسا

طاقت ور عقیدہ پیدا کیا جائے جو انھیں زندگی کے مادی اور لذتی تصور سے نکال کر اعلیٰ تر اقدار حیات سے آشنا کر سکے۔ جس قوم میں آخرت کا تصور کمزور پڑ جائے یعنی جس کو زندگی کے فوری مسائل اور جزوی ضروریات سے اتنی زیادہ دلچسپی ہو کہ وہ آئندہ کی فکر کرنے سے معذور ہو جائے اور اسباب و حالات کے بعید تر نتائج پر غور کرنا ناپسند کرے اس کا دنیوی انجام جس کو قرآن آخرت سے تعبیر کرتا ہے یقیناً رسوا کن ہوگا۔

قرآن نے جہاں جہاں کفار کی شکست اور تباہی کی پیشین گوئی کی ہے وہاں اس بات کی طرف صاف اشارہ کر دیا ہے کہ ان کی تباہی کی اصل وجہ یہ ہے کہ ان میں زندگی کا کوئی صحت بخش عقیدہ نہیں پایا جاتا۔ وہ ایمان و یقین کی روشنی سے محروم ہیں اور روزمرہ کی زندگی کے مسائل اور دلچسپیوں میں اتنے منہمک ہیں کہ انھیں زندگی کے بنیادی مسائل کی جن پر ان کے مستقبل کا دارومدار ہے کوئی پرواہ نہیں۔ چنانچہ مسلمانوں کو مخاطب کر کے اور ان کو فتح کی بشارت دیتے ہوئے قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ (٨:٦٥)

اگر تمھارے سو آدمی ہوں تو وہ کافروں کے ہزاروں پر غالب آ سکتے ہیں کیوں کہ کافر ایسی قوم سے تعلق رکھتے ہیں جو سمجھ بوجھ سے خالی ہے۔

یہاں کافروں کے اسباب شکست میں سے ایک سبب کو واضح کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے کہ تم ان پر اس لیے غالب رہو گے کہ وہ ایک بے سمجھ قوم ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ جہاں تک روزمرہ کے مسائل زندگی مثلاً کھانے پینے، تجارت و زراعت اور اسی قسم کے معاملات کا تعلق تھا جن سے فوری فوائد مقصود ہوتے ہیں، کفار بھی کم از کم اتنے ہی سمجھ دار تھے جتنے مسلمان۔ پھر وہ کون سی بے سمجھی ہے جس کے فقدان کی بابت قرآن کریم ہمیں توجہ دلاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ قرآن یہاں جس سمجھ کا ذکر رہا ہے وہ زندگی کے اصول اور کلی مسائل سے متعلق ہے جن کے صحیح تصفیہ کا دارومدار افراد و اقوام کے عقیدہ حیات اور ان کے نقطہ نظر پر ہے جو وہ زندگی کی حقیقت اور اس کے قوانین کے بارے میں قائم کرتے ہیں۔ جس قوم کا عقیدہ حیات جتنا

زیادہ پست اور ناقص ہوگا اور جس کا نقطہ نظر زندگی کے بنیادی قوانین کے بارے میں جتنا زیادہ غلط ہوگا وہ اپنی زندگی کے اہم مسائل اور معاملات کے تصفیہ میں اتنی ہی ٹھوکریں کھائے گی اور اتنا ہی زیادہ نقصان اٹھائے گی۔ بس یہی بات فرانسیسیوں کے متعلق بھی صحیح ہے۔ ان کے نوجوانوں میں تعلیم و تربیت کے ذریعے کوئی طاقتور عقیدہ نہیں پیدا کیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ زندگی کے فوری معاملات اور روزمرہ کے امور کی سمجھ بوجھ تو رکھتے تھے لیکن اپنی قوم کے مہمات مسائل پر ان کی نظر نہ تھی۔ یہی وجہ ہوئی جو انھوں نے انقلاب فرانس کے سیاسی نعروں اور خالی خولی جمہوری آزادیوں کو قومی نجات کے لیے کافی سمجھا اور اپنے ملک کی بڑھتی ہوئی طبقاتیت کی طرف ان کی نظر نہ گئی۔ بہ الفاظ دیگر ان میں یہ سمجھ نہ تھی کہ قومی زندگی کی طاقت کن عوامل پر مبنی ہوتی ہے اور کن عوامل سے قوموں میں کمزوری اور شکست پذیری کی صفات پیدا ہوتی ہیں۔ اسی طرح فرانسیسی قوم میں عقیدہ کی کمی کے باعث یہ کیفیت بھی پیدا ہوگئی کہ وہ فوری نفع کے آگے انجام کو نہیں سوچتے تھے۔ ان کی ساری سیاست بھی اسی مرض کا شکار تھی۔ مثلاً انھوں نے جرمنوں کو معاشی حیثیت سے تباہ و برباد اور مفلس و قلاش کرنے کی کوشش میں تاوان جنگ کا ناقابل برداشت بوجھ ان کے سر پر رکھ دیا۔ پھر جب وہ اس غیر معمولی بوجھ کو برداشت نہ کر سکے تو فرانسیسی حکومت نے روہر کے صنعتی علاقہ میں فوجیں بھیج کر اس جرمن صوبہ پر قبضہ کر لیا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ جرمنوں کے جمہوری لیڈر جو فرانس اور انگلستان کے دوست تھے اور ان دونوں کے ساتھ تعاون کرنا چاہتے تھے قوم کی نظروں میں ذلیل و خوار ہوگئے اور ہٹلر نے اس عام نفرت سے جو انگلستان اور فرانس کے خلاف جرمنوں میں پیدا ہوگئی تھی فائدہ اٹھا کر ان میں مقبولیت حاصل کر لی۔ ہٹلر نے برسر اقتدار آنے کے بعد جنگ کی تیاری شروع کی اور بالآخر فرانس کو شکست دے کر اس کی قومی طاقت کا شیرازہ بکھیر دیا۔ اگر فرانس اپنی دولت کے غرور اور فتح کی سرمستی میں اس پالیسی کے بعید تر نتائج کو فراموش نہ کر دیتا اور جرمنوں کے ساتھ زیادہ بہتر سلوک کرتا تو شاید ہٹلر کو برسر اقتدار آنے کا موقع ہی نہ ملتا۔ اسی طرح فرانسیسیوں نے رہائن لینڈ پر جرمن قبضہ کے وقت محض اس خوف سے فوجی کارروائی نہیں کی

کہ مبادا اس سے جنگ کے شعلے بھڑک اٹھیں اور فرانس کو پھر ایک بار جان و مال کی قربانیاں دینی پڑیں لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ مزید قریب آ گئی اور ہٹلر نے یکے بعد دیگرے آسٹریا اور چیکوسلاویکیہ کا بھی صفایا کر دیا۔ فوری خطرات کا یہ غیر معمولی خوف اور فوری فواید کی یہ غیر معمولی محبت زوال آمادہ قوم کی ایک امتیازی صفت ہے جس کی طرف قرآن مجید نے حسب ذیل آیت میں اشارہ کیا ہے:

اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ يُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَيَذَرُوْنَ وَرَآءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيْلًا (۷۶: ۲۷)

یہ لوگ یعنی کافر جلد ملنے والے نفع سے محبت کرتے ہیں اور اپنے پیچھے ایک بھاری دن کو چھوڑ دیتے ہیں۔

یعنی کفار زندگی کے معمولی مسائل پر جن سے ان کا فوری فایدہ وابستہ ہوتا ہے بہت زیادہ متوجہ رہتے ہیں کیوں کہ انھیں جلد ہاتھ آنے والے نفع سے بڑی محبت ہوتی ہے لیکن اس پر غور نہیں کرتے کہ مستقبل کدھر جا رہا ہے اور ان کے فوری فوایدآئندہ قائم رہیں گے یا نہیں۔ مثلاً ایک چور بازاری کرنے والا تاجر یہ تو سمجھ لیتا ہے کہ اس کو اس عمل سے اتنے لاکھ یا اتنے کروڑ کا فائدہ ہوگا لیکن اسے یہ فکر نہیں ہوتی کہ اگر چور بازاری کی شدت سے تنگ آ کر عوام کوئی انقلاب برپا کر دیں یا کوئی دشمن ان حالات سے فائدہ اٹھا کر قوم کو شکست دے دے یا اسے اور کسی بڑے نقصان میں مبتلا کر دے تو اس نفع سے فائدہ اٹھانے کا موقع اسے ملے گا یا نہیں۔ قرآن کریم کی یہ آیت جس میں بتایا گیا ہے کہ فوری نفع کی محبت کے آگے تم اس عذاب کو بھلا دیتے ہو جو اس ذہنیت کے باعث لازماً نازل ہوگا، ۱۹۱۴ء کے بعد کی انگریزی اور فرانسیسی سیاست پر حرف بہ حرف چسپاں ہوتی ہے۔ ان دونوں قوموں نے رہائن لینڈ، آسٹریا، چیکوسلاویکیہ، منچوریا، حبشہ اور البانیہ کے معاملہ میں فوری فوائد کی خاطر اور فوری خطرات سے محفوظ رہنے کے لیے سارے اصولوں' عہد ناموں اور ساری سیاسی ایمان داری کو بالائے طاق رکھ دیا اور اپنی بداعمالیوں اور بے ایمانیوں سے ڈنکرک کے یوم ثقیل کو قریب تر لے آئے۔ بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اگر رہائن لینڈ میں جرمن فوجوں

کے داخلہ کے وقت فرانس اپنی فوجیں مزاحمت کے لیے روانہ کر دیتا یا اگر حبشہ کے معاملہ میں فرانسیسی اور انگریز اطالیہ کے خلاف تدارکات کا استعمال کرتے تو ڈنکرک کا یوم ثقیل انھیں اتنی جلدی نہ دیکھنا پڑتا۔

اسٹاوسکی کے واقعہ نے فرانسیسی نظم ونسق اور فرانس کے سر برآوردہ طبقات کی اخلاقی کمزوریوں کا پردہ چاک کر کے دنیا پر یہ ظاہر کر دیا کہ یہ قوم تملیکی جذبات سے مغلوب ہو چکی ہے اور اس کے افراد میں روپیہ پیسہ اور دولت کی ہوس اتنی زیادہ بڑھ گئی ہے کہ اس کے آگے وہ اخلاقی اصولوں، قومی مفاد اور اپنے ملک کی حفاظت وصیانت کو بھی قربان کر دینے پر آمادہ ہے۔ ہٹلر کو فرانس کی ان کمزوریوں کا پورا پورا اندازہ تھا اور اسی وجہ سے اس نے یہ نتیجہ نکالا کہ فرانس کے لوگ اپنی قوم کی حفاظت یا اپنے عہد ناموں کی پابندی کے لیے کوئی مالی یا جانی قربانی نہیں کر سکتے۔ اگر اسے ان باتوں کا احساس نہ ہوتا تو وہ رہائن لینڈ اور آسٹریا پر اس دیدہ دلیری سے قبضہ نہ کر لیتا جیسا کہ گزشتہ صفحات میں بیان کیا جا چکا ہے۔ اسٹاوسکی اپنی لوٹ کھسوٹ میں اس وجہ سے کامیاب رہا کہ فرانسیسی حکومت کے بڑے بڑے عہدہ داروں اور ارکان پارلیمنٹ سے اس کی دوستی تھی اور یہ لوگ واقعات کو جانتے بوجھتے اپنے شخصی اور طبقاتی مفاد کی خاطر اس کی بدعنوانیوں پر پردہ ڈال دیتے تھے۔ پھر فرانس کے محکمہ جات پولیس اور عدالت بھی اس کے خلاف کوئی کارروائی کرنے سے قاصر رہے کیوں کہ اس نے رشوتیں کھلا کر پولیس اور عدالت کے عہدہ داروں کی زبانیں بند کر دی تھیں۔ حالانکہ یہ سب لوگ اس امر سے بخوبی واقف تھے کہ اسٹاوسکی کی سٹہ بازی اور فریب دہی سے نہ صرف قومی مفاد کو نقصان پہنچے گا بلکہ ہزاروں فرانسیسیوں کی معاش پر بھی ان کارروائیوں کی زد پڑے گی۔ کسی قوم کے افراد میں اسٹاوسکی جیسے انسانوں کا اس آزادی سے اور بے خوفی سے دوسرے لوگوں کو نقصان پہنچانے میں کامیابی حاصل کر لینا اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کے معاشی اخلاق کو گھن لگ چکا ہے اور یہ یاد رہے کہ معاشی اخلاق انسان کی مجموعی اخلاقی زندگی کا ایک حصہ ہے۔ جس قوم کا معاشی اخلاق خراب ہو اس کی کل اخلاقی زندگی خراب ہو گی

کیوں کہ اخلاق کا ہر شعبہ دوسرے سے وابستہ اور اس سے متاثر ہوتا ہے۔ اسٹاوسکی اور اس کے جیسے دوسرے فرانسیسیوں کی ذہنیت وہی تھی جس کا ذکر قرآن نے زوال پذیر قوموں کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے کیا ہے، قوم مدین کو حضرت شعیب علیہ السلام نے اسی ذہنیت پر متنبہ کرتے ہوئے کہا تھا:

وَيٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ (۸۵:۱۱)

اے قوم مدین ناپ اور تول کو انصاف کے ساتھ پورا کرو اور لوگوں کی چیزیں کم کر کے نہ دیا کرو۔

موجودہ زمانہ کی چور بازاری، سٹہ بازی اور دیگر معاشی بے ایمانیاں جن کی وجہ سے ایک شخص کا فائدہ ہزاروں لاکھوں انسانوں کے نقصان کے باعث ہوتا ہے اسی لاتبخسوا الناس اشیاء ھم کے ذیل میں آتی ہیں اور ان کا وجود اور پھیلاؤ یہ ثابت کر رہا ہے کہ جو قومیں ان خرابیوں میں شدت سے مبتلا ہیں وہ قوم مدین کی طرح تباہی اور بربادی کی منزل سے قریب تر آ گئی ہیں۔

فرانس کی طرح انگلستان اور امریکہ کے حالات سے بھی ہم یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہیں کہ انگریز اور اہل امریکہ بھی کم و بیش انھیں خرابیوں میں مبتلا ہیں جن میں فرانس کے باشندے مبتلا تھے۔ یہ تمام خرابیاں جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں تملیکی جذبات کی زیادتی اور تعمیری جوش کی کمی سے وجود میں آتی ہیں۔ ہم نے انگلستان اور امریکہ کے حالات میں یہ بتایا ہے کہ ان ملکوں کی بین الاقوامی سیاست جس محور پر گردش کر رہی ہے وہ یہ ہے کہ کسی طرح کمیونزم کا توڑ کیا جائے اور روس کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا جائے۔ یہ جذبہ ان ملکوں میں اس لیے پیدا ہوا کہ انھوں نے دنیا کی پسماندہ قوموں کو لوٹ کھسوٹ کر خوب دھن دولت جمع کر لیا ہے۔ اب انھیں خطرہ یہ ہے کہ روس کی کامیابی اور کمیونزم کے فروغ سے ان کی اس معاشی برتری اور اقتصادی عظمت کو اتنا بڑا دھچکا پہنچے گا کہ ان کا سارا مال و متاع اور ان کے تمام اسباب عیش اور وسائل زینت ان سے چھن جائیں گے۔ اسی خطرہ نے ان کو اس بات پر

آمادہ کر دیا کہ یہ روس کے خلاف ہٹلر، مسولینی اور ٹوجو کی حوصلہ افزائی کریں لیکن ان رجعت پسند اور جابر حکمرانوں کو روس کے خلاف کھڑا کر دینے میں انھوں نے یہ نہیں دیکھا کہ وہ ان کے اپنے اقتدار و طاقت کے درپے ہو جائیں گے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہٹلر نے، مسولینی اور ٹوجو نے روس سے بھڑنے کے بجائے پہلے انگلستان، فرانس اور امریکہ سے ٹکر لی۔ اس طرح ان ممالک کی تدابیر الٹی پڑ گئیں اور انھیں کے لیے خطرہ کا باعث بن گئیں، اسی بے تدبیری اور غیر ایمان دارانہ سیاست کو قرآن مکر السّیّ سے تعبیر کرتا ہے اور فرماتا ہے:

وَلَا یَحِیْقُ الْمَکْرُ السَّیِّیءُ اِلَّا بِاَھْلِهٖ (۴۳:۳۵)

جو لوگ بری تدابیر مال و دولت یا اقتدار کی حفاظت کے لیے اختیار کرتے ہیں ان کی تدابیر انھی پر الٹ پڑتی ہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ انگریز اور امریکہ کمیونزم کو توڑنے کے لیے اور کیا تدابیر اختیار کرتے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ان میں تعمیر و تخلیق کا جوش موجود ہوتا تو یہ اپنی فاضل دولت اور غیر معمولی فنی ترقیوں کو پسماندہ اقوام کے ابھارنے اور ترقی دینے میں استعمال کرتے اور اس طرح روس کے پروپیگنڈے اور کمیونزم کے نعروں کو شکست دے دیتے۔ اگر انھوں نے کوئی ایسی ایجابی پالیسی اختیار کی ہوتی تو پسماندہ ممالک میں کمیونزم کا چرچا نہ پھیلتا کیوں کہ کمیونزم تو معاشی بے اطمینانی اور فاقہ زدگی سے پیدا ہوتی ہے۔ جس ملک میں طبقاتیت اور بے اعتدالی ظلم کی حد تک نہ پہنچی ہو، جہاں کے بالاتر طبقات کمزوروں اور غریبوں سے ناجائز فائدہ حاصل کر کے ان پر ظلم و ستم نہ توڑتے ہوں، جہاں معاشی اخلاق اور انصاف کا معیار بلند ہو، وہاں کمیونزم ایک روز بھی پنپ نہیں سکتا۔ کمیونزم کی پیدائش اور فروغ کا سبب ہی یہ تھا کہ سرمایہ دار ممالک اور سرمایہ دار طبقات نے مال و دولت کی ہوس اور اقتدار کی حرص میں مبتلا ہو کر پسماندہ ممالک اور غریب طبقات کو لوٹنا اور کھسوٹنا شروع کر دیا۔ اگر یہ صورت نہ ہوتی بلکہ سرمایہ دار ممالک اور طبقات اپنی زاید دولت کو تعمیری و تخلیقی کاموں پر صرف کرتے رہتے اور اس پر پسماندہ اقوام و طبقات کا

حق تسلیم کر کے ان کی معاشی ترقی اور تعلیمی حالت کی اصلاح کے لیے مناسب تدابیر اختیار کرتے تو روس میں بالشویک انقلاب رونما نہ ہوتا یا اگر ہوتا تو روسی بالشویکوں کا پروپیگنڈا دوسرے ملکوں میں بے اثر رہتا۔ کمیونزم اور روسی اثر کے روز افزوں اضافہ کی وجہ یہ ہے کہ سرمایہ دار ممالک اور طبقات نے ان کے خلاف ایک منفی طریق کار اختیار کیا ہے۔ اگر یہ لوگ کمیونزم کے خلاف پراپیگنڈہ کرنے اور اسلحہ سازی اور فوجی تیاری پر روپیہ صرف کرنے کے ساتھ ساتھ محکوم قوموں کو آزادی دے دیتے، نیم آزاد قوموں مثلاً کوریا، فلپائن، وغیرہ پر ظالمانہ حکومتوں کے تسلط کو برداشت نہ کرتے اور اپنا روپیہ پیسہ محض غیر ایمان دارانہ سیاست پر نہ صرف کرتے بلکہ انسانیت دوستی اور تعمیر و تخلیق کے جذبہ سے متاثر ہو کر مفیدِ انسانیت کاموں پر بھی اپنے معاشی وسائل کا کچھ حصہ لگا دیتے تو کمیونسٹ تحریک خود بخود دفنا ہو جاتی۔ لیکن انھوں نے کمیونزم کی منفی مخالفت شروع کر دی اور اس کے اثر کو زائل کرنے کے لیے کوئی ایجابی تدبیر نہ اختیار کی اس طرح انھوں نے اپنی بداعمالیوں اور غیر ایمان دارانہ سیاست سے کمیونزم کو خود ہی نشو ونما اور ترقی کے وسائل فراہم کر دیے۔ چین کی حالیہ تاریخ ہمارے اس دعویٰ کا ثبوت ہے۔ امریکہ نے چیانگ کائی شک اور اس کی ظالمانہ حکومت کو قائم رکھنے کے لیے جس قدر بے اندازہ دولت اس کو اور اس کے حامیوں کو عنایت کی اور جتنا فوجی سامان اس کی مدافعت کے لیے روانہ کیا اس کا اثر تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ کمیونسٹوں کو شکست ہو جاتی لیکن ہم نے دیکھا کہ امریکہ کا سارا فوجی ساز و سامان کمیونسٹوں کے ہاتھ لگا اور جتنا روپیہ امریکہ نے چیانگ کی حکومت کو دیا اس کا عوام کو کوئی فائدہ نہ پہنچا بلکہ وہ چیانگ کائی شک کی پارٹی کے چند سرمایہ داروں اور اس کی حکومت کے بعض عہدہ داروں کی جیبوں میں پہنچ گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ظالم حکومتوں اور غیر منصف مزاج پارٹیوں کو مدد دینا ایک بہت بڑا گناہ ہے جس کو قدرت برداشت نہیں کرتی کیوں کہ اس سے انسانیت کو فائدہ کی جگہ نقصان پہنچتا ہے۔ امریکہ نے کمیونزم کی مخالفت میں یہ نہیں دیکھا کہ وہ کس قسم کے لیڈروں کو فوجی اور مالی امداد دے رہا ہے۔ لہٰذا

اس نے اپنی اندھی دشمنی اور غیر تخلیقی روش سے اپنے پیروں پر خود کلہاڑی ماری۔ امریکہ کے باشندوں پر تملکی جذبات کتنے غالب ہیں اس کا حال ہمیں ان رپورٹوں سے معلوم ہوتا ہے جو وقتاً فوقتاً امریکی سنات کی تحقیقاتی کمیٹیوں کی طرف سے شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ایسی چند رپورٹوں کا خلاصہ ہم گزشتہ صفحات میں درج کر چکے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ کے اسلحہ ساز کارخانہ داروں اور صنعت کاروں نے محض طبقاتی مفاد کی خاطر اپنے ملک کی پالیسی کو غلط راستہ پر ڈالنے کی کوشش کی تاکہ جنگی تیاریوں کا زور وشور ہو اور ان کے بنائے ہوئے اسلحہ کے لیے ایک بڑی وسیع مارکیٹ پیدا ہو جائے۔ جس قوم کے لوگ اپنے شخصی اور طبقاتی مفاد کے آگے قومی مفاد کی پرواہ نہ کریں اور دیدہ دانستہ ان نتائج سے آنکھیں بند کر لیں جو ان کے اعمال سے پیدا ہو سکتے ہیں اس کی فلاح و بہبود کی کیا امید ہو سکتی ہے؟

ہماری اس بحث کا مختصر خلاصہ یہ ہے کہ قوموں پر زوال وانحطاط کا عمل اس وقت شروع ہوتا ہے جب وہ قرآن کریم کے بیان کے مطابق حب الشہوات میں مبتلا ہو جاتی ہیں یعنی تعمیری جذبات اور تخلیقی جوش سے محروم ہو کر ان کے افراد تملکی جذبات سے سرشار ہو جاتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا قومیں شعوری طور سے ان تمام خرابیوں کا مداوا کر سکتی ہیں یا وہ اپنے جذبات وخواہشات سے مجبور اور ان کے نتائج کی پابند ہیں۔ بہ الفاظ دیگر کیا قوموں کے تخلیقی جذبات اور ان کی تعمیری امنگوں کو شعوری طریقہ سے ترقی دی جا سکتی ہے اور ان کو تملکی جذبات کے غلبہ سے محفوظ رکھا جا سکتا ہے یا یہ سارا عمل ایک تاریخی وجوب کے طور پر واقع ہوتا ہے اور افراد اپنے ارادہ واختیار سے قومی زوال وانحطاط کے عمل کو روکنے پر قادر نہیں ہیں۔ قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ قومیں اپنی تقدیر کو اپنے ارادہ اور عمل سے بدل سکتی ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (۱۳:۱۱)

اللہ تعالیٰ کسی قوم کو نہیں بدلتا جب تک وہ قوم اپنے آپ کو نہ بدلے۔

یعنی قوموں کو پہلے اپنے نفس اجتماعی میں خود تبدیلی پیدا کرنی چاہیے، تب خدا ان کی مدد

کرے گا۔اس سے یہ نتیجہ لازم آتا ہے کہ اگر کسی قوم کی صحیح رہنمائی کی جائے اور اس کے لیڈر یا حکمران یہ ارادہ کرلیں کہ وہ شخصی مثال، تعلیم و تربیت اور پروپیگنڈے کے ذریعے قوم کے تعمیری جذبات اور تخلیقی امنگوں کو فروغ اور نشو ونما دیں گے اور اس کے تملیکی جذبات کو حد اعتدال سے آگے نہ بڑھنے دیں گے تو وہ اپنی قوم کو زوال وشکست سے بچا سکتے ہیں۔ یہ تبدیلی اس طرح پیدا کی جا سکتی ہے کہ پہلے حکمران طبقات اور مال دار اشخاص خود اپنی زندگی میں اعتدال پیدا کریں اور زینت وآرائش، عیش پرستی اور شہوت رانی کی عادات ترک کریں۔قوم کے سربرآوردہ طبقات میں اگر اس قسم کی تبدیلی پیدا ہو جائے تو متوسط اور غریب طبقات پر اس کا لازمی اثر یہ ہوگا کہ وہ بھی اپنے غلط طرز حیات، مسرفانہ عادات اور لذت پرست رجحانات پر قابو حاصل کرلیں گے۔ یہ یاد رہے کہ عیش پرستانہ اور مسرفانہ عادات کی ایک بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ بعض افراد وطبقات کے قبضہ میں اتنی وافر زمین یا سرمایہ آ جاتا ہے کہ انھیں حصول رزق کے لیے کوئی جدوجہد نہیں کرنی پڑتی اور وہ گھر بیٹھے آرام واطمینان سے اپنی زاید دولت یا زمین کی آمدنی سے اسراف وتعیش کی زندگی بسر کر سکتے ہیں۔اس لیے جو قوم اپنے معاشی نظام میں ایسے مفت خوروں کی رورعایت کرتی ہے اور زاید زمین یا سرمایہ کو چند ہاتھوں میں جمع ہو جانے دیتی ہے وہ درحقیقت اپنے زوال وانحطاط کا سامان خود ہی مہیا کرتی ہے ۔ایک صحت مند ترقی پذیر معاشرہ کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ کسی فرد کو بغیر محنت ومشقت اور بغیر جدوجہد کے آرام وآسائش کی زندگی بسر کرنے کا موقع نہ دے۔

پھر دوسرا ضروری امر یہ ہے کہ تعلیم وتربیت کا پورا نظام اس طرح وضع کیا جائے جس سے قوم کے بچوں اور نوجوانوں میں زندگی کے متعلق صحیح عقیدہ اور رویہ پیدا ہو۔اگر کسی ملک کا نظام تعلیم صحیح اصولوں پر مبنی ہو اور اس کے معلموں اور اساتذہ کی شخصی زندگی اس طرز کی ہو جس سے تملیکی جذبات کے بجائے تعمیری اور تخلیقی جذبات ابھریں اور ترقی کریں تو وہ اپنی آیندہ نسل میں ایک طاقت ور عقیدہ اور اخلاق پیدا کر سکتا ہے جس سے اس کے اندر معاشی دیانت، سیاسی ایمان داری اور عقل وفکر کی راست بازی کی صفات نشو ونما پائیں گی پھر

اخبارات، ریڈیو اور نشر و اشاعت کے دوسرے طریقوں سے قوم کے تملکی جذبات کو دبایا اور تعمیری صفات کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی قوم ان خطوط پر کام کرنا شروع کر دے تو دس پندرہ سال کی مختصر مدت میں وہ عرصہ دراز کی خرابیوں کا قلع قمع کر سکتی ہے۔ بالخصوص مسلمان قوم پر اگر اس قسم کا عمل کیا جائے تو چوں کہ اس کے اندر کسی نہ کسی درجہ میں اسلامی عقیدہ باقی اور موثر ہے، اس لیے یہ قوم بہت تھوڑے عرصہ میں زوال و انحطاط کے بھنور سے نکل کر عروج و ترقی کی شاہ راہ پر گامزن ہو سکتی ہے۔

☆☆☆

حواشی

1. یہ ضروری نہیں ہے کہ اس قسم کی انقلابی اور اصلاحی جماعتوں یعنی تخلیقی گروہوں میں وہ تمام صفات موجود ہوں جن کا قرآن نے ذکر کیا ہے۔ لیکن یہ بات یقینی ہے کہ تاریخ کے تمام تخلیقی اور انقلابی گروہوں میں قرآن کی بیان کردہ اکثر و بیشتر صفات پائی جاتی ہیں۔ مثلاً انقلاب فرانس کے داعیوں میں صدق صبر اور انفاق کی صفات تو پائی جاتی تھیں لیکن استغفار توبہ اور دیگر ایمانی صفات ناپید تھیں اسی طرح روسی بالشویکوں میں بھی آخر الذکر صفات موجود نہ تھیں۔ لیکن وہ اپنے مقصد کے سچے تھے اس کے لیے مالی ایثار اور جانی قربانی سے دریغ نہ کرتے تھے۔ اور اپنے وعدوں اور اعلانات کو پورا کرنے میں کوتاہی نہیں کرتے تھے۔ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کرام کی جماعت میں قرآن کی بیان کردہ تمام صفات پائی جاتی تھیں۔

2. یورپ کی سرمایہ دارانہ تہذیب کے عروج وارتقاء کا بنیادی سبب یہی ہے کہ اس نے آیات فطرت پر غور کرنا سیکھا اور مشاہدہ فطرت سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ عالم طبعی پر ایک واحد قانون کی فرمانروائی ہے، اس طرح یورپ نے عقیدہ توحید کے ایک اہم جزو کو اپنا کر مشرکانہ رسوم، روایت پرستی، توہم زدگی اور بے معنی ظواہر وشعائر سے اپنا دامن چھڑا لیا۔ پھر قوانین فطرت کا استنباط کر کے اس نے ان کا اطلاق عملی زندگی پر کرنا شروع کیا۔ اور اس کوشش کے سلسلہ میں ایسے ایسے نادر حقائق دریافت کیے جنھوں نے زندگی کے ہر شعبہ میں نئی نئی ایجادات وانکشافات کا دروازہ کھول دیا نیز انسان کی حیاتیاتی اور تمدنی زندگی کے بارے میں نہایت بیش قیمت معلومات فراہم کیے۔ لیکن سرمایہ داروں نے آیات تاریخ سے غفلت برتی اور جن عوامل سے قومیں تباہ وبرباد ہوتی ہیں، ان پر انگریز اور امریکن ملوکیت پرستوں کی نگاہ نہیں پڑی۔ جس کا نتیجہ اب چین کوریا اور ایران وغیرہ میں ظاہر ہو رہا ہے۔

سرمایہ دارانہ تہذیب کے برعکس اشتراکی تہذیب نے آیات تاریخ پر غور کر کے واقعات تاریخ کی توجیہہ وتعبیر کا ایک ایسا طریقہ دریافت کیا جس میں صداقت کا کافی عنصر موجود ہے اور جو قرآن کے نظریہ تاریخ سے ملتا جلتا ہے۔ اس نے تاریخ کو ایک واحد قانون یعنی مادی اور معاشی عوامل کا نتیجہ قرار دے کر عقیدۂ توحید کے ایک اور حصہ کو اڑا لیا لیکن یہ دونوں تہذیبیں توحید کے دو مختلف اجزا پر مبنی ہیں۔ پوری توحید قرآن ہی سے مل سکتی ہے اور آخری کامیابی اسی تہذیب کو حاصل ہوگی جو قرآن کے توحیدی نظریہ حیات پر کامل طور سے مبنی ہو۔

۳ بعد میں یہی جرمن اقوام رومی عیسائیوں کی حاکم بن گئیں اور ان کے ملک میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئیں کیوں کہ رومی عیسائیوں کے برعکس جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خالص توحید کو چھوڑ کر شرک و بت پرستی میں مبتلا تھے۔ جرمن فاتحین تصاویر کی پرستش نہیں کرتے تھے اور نہ ان کے اندر اولیا اور بزرگوں کی کرامات اور تبرکات کے متعلق کوئی خاص عقیدہ پایا جاتا تھا۔

۴ قرآن انقلاب تاریخ میں سوسائٹی کی طبقاتی ہیئت کو کافی اہمیت دیتا ہے لیکن کمیونزم کے برخلاف وہ اس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ صرف طبقاتی جنگ ہی تاریخ کا فیصلہ کن عنصر ہے اور نہ اس سے وہ یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ طبقات کے وجود کو بالکل فنا کر کے ایک خالص لاطبقاتی معاشرہ قائم کیا جا سکتا ہے، البتہ وہ یہ کہتا ہے کہ جب مالدار طبقات سوسائٹی کے غریب اور کمزور افراد کے حقوق کو پامال کرنا شروع کر دیتے ہیں اور ان میں استکبار کی صفت پیدا ہو جاتی ہے یعنی وہ قوم کے متوسط الحال اور غریب افراد کے بالمقابل اپنی برتری اور تفوق کی نمائش کرنے لگتے ہیں اور ان کی تحقیر و تذلیل کرتے ہیں، اس وقت قوم بحیثیت مجموعی زوال اور تباہی کی طرف جانے لگتی ہے۔

۵ اسٹراسبرگ فرانسیسی جرمن سرحد پر فرانس کا ایک شہر ہے۔

۶ International Politics by Predrick L.Schuman

اسلام کا نظریہ تاریخ

محمد مظہر الدین صدیقی

تیسری منزل، حسن مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

Mob. 0300-8834610 Tel .042-7232731

maktaba_jamal@email.com/maktabajamal@yahoo.co.uk